ISSN 2321-4627

ستمبر 2022ء

-/15روپے

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، سائنسی، فنی و سماجی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

عبدالرحمان چغتائی

تاریخ پیدائش: 21/ستمبر 1897ء

www.urduacademyts.com

جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ عزت مآب وزیراعلیٰ حکومت تلنگانہ 76 ویں یوم آزادی ہند کے موقع پر
قلعہ گولکنڈہ میں گارڈ آف آنر کا معائنہ کرتے ہوئے

آزادی ہند کے 75 سال کی تکمیل پر 13 تا 22 اگست 2022 ''منعقدہ ڈائمنڈ جوبلی'' کی اختتامی تقریب کے موقع پر لی گئی تصویر میں جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ عزت مآب وزیراعلیٰ حکومت تلنگانہ، جناب محمد محمود علی عزت مآب وزیر داخلہ، محابس و فائر سرویسیز حکومت تلنگانہ، جناب کے۔ کیشو راؤ رکن راجیہ سبھا و چیرمین سوتنترا بھارت وجروتسوم کمیٹی، جناب ٹی۔ سرینواس یادو عزت مآب وزیر افزائش مویشیان، سمکیات، ڈائری ڈیولپمنٹ و سینماٹوگرافی، جناب وی۔ پرشانت ریڈی عزت مآب وزیر عمارات و شوارع، امور مقننہ و ہاؤزنگ، جناب وی۔ سرینواس گوڑ عزت مآب وزیر اکسائز، اسپورٹس، یوتھ سرویسیز و آرکیالوجی، جناب ای۔ دیا کر راؤ عزت مآب وزیر پنچایت راج، دیہی ترقی و آر ڈ بلیو ایس، جناب اسدالدین اویسی معزز رکن پارلیمنٹ حیدرآباد، جناب خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی، دیگر عہدیداران اور عوامی نمائندے دیکھے جاسکتے ہیں

www.urduacademyts.com

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد
تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و تہذیبی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد : 07 شمارہ : 09 ستمبر 2022ء

زیرنگرانی
محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ایڈیٹر
شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس
ڈائریکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی
چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی
حیدرآباد- 001 500 (تلنگانہ)

مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب و تزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages : 84

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر
بنام ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور
وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے
ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Shah Nawaz Qasim and published by
Shah Nawaz Qasim on behalf of Telangana State Urdu Academy
Minorities Welfare Dept., Government of Telangana.
Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and
Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul,
Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally,
Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810, 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

قرینہ

ہم کلامی	:	شاہ نواز قاسم آئی پی ایس ڈائرکٹر/سکریٹری	4
اپنی بات	:	محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی	5
تعلیم و تدریس			
جدید تدریسی تقاضے اور اساتذہ کی اخلاقی و پیشہ وارانہ ترجیحات	:	فاروق طاہر	6
تخلیقی تحریر کی صلاحیت	:	محمد ارسد انصاری	11
مضامین			
مفکر اسلام ڈاکٹر محمد حمید اللہ عہد ساز شخصیت	:	ڈاکٹر موسیٰ اقبال	17
جاں نثار اختر کی شاعری	:	ڈاکٹر حمیرہ تسلیم	23
حکیم سید شمس اللہ قادری کی علمی و تحقیقی خدمات	:	ڈاکٹر حکیم رئیس فاطمہ	28
اُردو زبان اور اس کا رسم الخط	:	ایم۔اے۔کنول جعفری	36
ڈاکٹر حسن الدین احمد کا اردو ترجمہ ''شریمد بھگوت گیتا''	:	کے۔رحمت اللہ	44
ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز بحیثیت صحافی	:	آمنہ مقبول	50
ماحولیات			
ماحول کی آلودگی اور اس کا تحفظ	:	سونور جک اور آفتاب عالم	55
قرآن کا ماحولیاتی تصور	:	محمد عامر مجیبی	62
افسانے			
ستاروں سے آگے	:	قرۃ العین حیدر	68
بے گور	:	جوگیندر پال	73
ہیلپ لائن	:	حنیف سید	78
حصہ نظم			
غزلیں	:	اقبال شیدائی / ڈاکٹر قطب سرشار	80
	:	ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل / محمد حمید عکسی	81
	:	والی محمد زاہد ہریانوی / ذکیہ شیخ مینا	82

oOo

www.urduacademyts.com

ہم کلامی

ماہ ستمبر 2022ء کا شمارہ آپ کی نذر ہے۔اس شمارے کی ابتداء ہم نے ''تعلیم وتدریس'' کے عنوان کے تحت دو مضامین سے کی ہے جس میں جدید تدریسی تقاضے اور اساتذہ کی اخلاقی پیشہ وارانہ ترجیحات پر ایک مضمون اور تخلیقی تحریر کی صلاحیت پر ایک مضمون شامل ہے' دیگر مضامین میں نامور ادیب ومفکر ڈاکٹر محمد حمید اللہ' ممتاز شاعر جاں نثار اختر کی شاعری' حکیم سید شمس اللہ قادری کی علمی خدمات' اردو زبان اور اس کا رسم الخط' ڈاکٹر حسن الدین احمد کا بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ اور حیدرآباد کے ممتاز صحافی سید فاضل حسین پرویز پر اساتذہ و اسکالرس کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔علاوہ ازیں ماحولیات کے عنوان کے تحت دو مضامین ''ماحول کی آلودگی اور اس کا تحفظ'' اور ''قرآن کا ماحولیاتی تصور'' شائع کئے گئے ہیں۔اسی طرح حسب معمول نامور افسانہ نگاروں کے تین کلاسیکل افسانے اور آخر میں ممتاز شعراء کا کلام شائع کیا گیا ہے۔امید کہ یہ تمام نگارشات قارئین ریسرچ اسکالرس اور محبان اردو کی معلومات اور دلچسپیوں میں اضافہ کا باعث ہوں گی۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہمارے ملک ہندوستان میں 2001 کی مردم شماری کے مطابق، 122 بڑی زبانیں اور 1599 دیگر زبانیں بولی جاتی ہیں۔ان زبانوں میں ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں تقریباً 85,061,078 لوگ اردو زبان بولتے' پڑھتے اور لکھتے ہیں جن میں ہر قوم و مذہب کے لوگ شامل ہیں۔اردو کسی خاص طبقہ اور مذہب کی زبان نہیں ہے۔یہ زبان بنی ہی مختلف زبانوں کے سنگم سے۔اس میں زیادہ تر ہندی' عربی' فارسی' کے علاوہ سنسکرت' مرہٹی' تلگو اور دیگر زبانوں کے ہزاروں الفاظ ہیں۔اس لئے اسے کسی خاص طبقہ سے جوڑنا اس زبان کے ساتھ ناانصافی ہے۔تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی نے اس غلط فہمی کو دور کرنے اپنے اگلے شمارے کو ''اردو کے غیر مسلم شعراء وادبا'' کے نام کیا ہے جس میں اُردو زبان وادب کے خدمت گار غیر مسلم ادبا وشعراء کے علمی وادبی کارناموں پر مشاہیر دانشوران' ادبا وشعرائے کرام کے مضامین شائع کئے جارہے ہیں۔امید کہ یہ تحریریں ان شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے میں مدد ومددگار رہوں گی اور یہ بات صاف ہوجائے گی کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔آج اُردو ہندوستان کے علاوہ پاکستان' بنگلہ دیش' افغانستان' ایران' سعودی عرب' خلیجی ممالک دیگر ممالک جرمنی' جاپان' امریکہ' انگلینڈ' کیناڈا اور یورپی ممالک میں بھی لاکھوں اردو بولنے والے ہیں جن میں ہر طبقہ و مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی مادری زبان کی اہمیت کو سمجھیں اور اس زبان کو باقی رکھنے کی کوشش کریں۔

محبان اُردو کو چاہیے کہ اس زبان کی ترقی وفروغ میں حصہ لیں اور سب سے بڑا حق اس کا یہ ادا ہوگا کہ اردو خود بھی سیکھیں اور اپنی نئی نسل کو اس زبان کی طرف راغب کریں۔حکومت تلنگانہ بھی اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے کافی سنجیدہ ہے اور اس خصوص میں ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔دوسری سرکاری زبان کی تعمیل کے لئے دفاتر میں اردو آفیسرس کا تقرر بھی کیا گیا اور اس زبان کے فروغ وتحفظ کے لئے اردو اکیڈیمی کے ذریعہ کئی ایک اسکیمات کو جاری رکھا گیا ہے جن میں بعض معلنہ سرکاری اسکیمات پر عمل آوری کا کام جاری ہے۔امید ہے کہ باقی اسکیمات بھی جلد تکمیل کو پہنچ جائیں گی۔

فروغ اُردو کی کوششوں میں آپ تمام قارئین ومحبان اردو کے تعاون اور مشوروں کی ضرور قدر کی جائے گی۔

شاہ نواز

شاہ نواز قاسم' آئی پی ایس

ایڈیٹر

www.urduacademyts.com

اپنی بات

اس سال ماہ اگست میں ہم نے 13 اگست تا 22 اگست انگریزوں سے اپنے عظیم ملک ہندوستان کی آزادی کے 75 سال مکمل ہونے کی خوشی میں ڈائمنڈ جوبلی تقاریب منائیں ۔ ہر سرکاری' تاریخی' خانگی اور اہم عمارتوں کو جگمگاتی روشنیوں سے منور کیا' مختلف ثقافتی' تہذیبی اور ادبی پروگرامس منعقد کئے ۔ یہ سب خوشیاں غاصب غیر ملکی انگریزوں کو اس ملک سے نکالنے اور ان کے ظلم وستم سے آزاد ہونے کی مسرت میں منائی گئیں ۔ اس موقع پر ہمارے موجودہ قائدین وعلماء نے ہمیں اُن حالات وواقعات سے بھی واقف کروایا جن میں ہم نے تقریباً 200 سال ظالم انگریزوں کے مظالم سہے' ہمارے عظیم قائدین' علمائے کرام اور ملک کے جیالے عوام نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا' جیلوں کی صعوبتیں برداشت کیں ۔ ان قربانیوں کے نتیجہ میں ہمیں آزادی ملی اور ہمارے بڑوں نے آزاد ملک کا دستور ترتیب دیا جس میں ہر مذہب' طبقہ اور علاقہ کے لوگوں کو اپنی تہذیب' اپنے کلچر' اپنی زبان' اپنی ثقافت کو برقرار رکھنے کی آزادی دی گئی' تعلیم وروزگار میں سب کا حصہ رکھا گیا ۔ کاروبار' صنعت وحرفت کی آزادی دی گئی ۔ اس طرح ہمیں ہر جائز حق کو حاصل کرنے اور اس حق سے فائدہ حاصل کرنے کا اختیار دیا گیا ۔ غیر جانبدار عدالتیں قائم ہوئیں تاکہ ہمیں پورا پورا انصاف ملے ۔ سرکاری اقلیتی محکمے قائم ہوئے جن کے ذریعہ تمام اقلیتوں کو ان کے حقوق دیے گئے ۔ خاص کر دستور کی دفعہ 30 کے ذریعہ تمام مذہبی ولسانی اقلیتوں کو ان کی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور حکومتوں سے ان اداروں کے لئے مالی امداد حاصل کرنے کا بھی حق دیا گیا ہے ۔

حکومت تلنگانہ نے دستور ہند کی مراعات کی روشنی میں اقلیتوں کو ان کے حقوق کی ادائیگی کی بھرپور کوشش کی ہے ۔ ہماری ریاست کے عزت مآب وزیر اعلیٰ جناب چندر شیکھر راؤ صاحب نے اُردو زبان کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ۔ اُردو ادب کی ترقی' تحفظ وفروغ کے لئے محکمہ اقلیتی بہبود کے ادارے تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے ذریعہ کئی اسکیمات کو جاری کیا گیا ۔ تعلیم وروزگار کے سلسلہ میں اقلیتوں کو بھی برابر کا حقدار بنانے کئی ایک پراجکٹ واسکیمات کو جاری کیا ہے ۔ ان میں تلنگانہ اقلیتی تعلیمی ادارہ جات سوسائٹی کے ذریعہ ریاست بھر میں 204 اقامتی جونیر کالجس واسکولس کا قیام عمل میں لایا گیا جہاں طلبا کی کامیابی کا شاندار ریکارڈ آیا ہے ۔ حکومت کی جانب سے اسٹیڈی سرکل اور عثمانیہ یونیورسٹی کے مرکز تعلیمی ترقی برائے اقلیتی طبقات کے ذریعہ اقلیتوں کو مدارس ومسابقتی امتحانات میں آسانی کے لئے کوچنگ اور نصابی مواد اردو میں فراہم کیا گیا' اسی طرح دیگر فلاحی اسکیمات کو ریاستی وقف بورڈ اور ریاستی اقلیتی مالیاتی کارپوریشن ودیگر سرکاری اقلیتی شعبوں کے ذریعہ جاری رکھا گیا ہے ۔

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کی جاری اسکیمات میں چھوٹے اُردو اخبارات و اُردو الیکٹرانک میڈیا کے نمائندوں کو سال 2021-22 کی سالانہ مالی اعانت کی اجرائی کردی گئی ہے' اسی طرح اردو مصنفین کو ان کی کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت اور مطبوعہ کتابوں پر انعامات کا کام آخری مراحل میں ہے' امید کہ بہت جلد ان اسکیمات اور دیگر معلنہ اسکیمات کی بھی عمل آوری ہو جائے گی ۔ بہرحال میری کوشش رہے گی کہ تمام اسکیمات اپنے وقت پر تکمیل کو پہنچیں ۔ میری خواہش ہے کہ فروغ اردو کے سلسلہ میں مزید کارآمد پروگرامس پیش کئے جائیں' اس سلسلہ میں دانشوران اُردو سے مشاورت جاری ہے ۔ ان کاموں کے لئے آپ تمام محبان اردو کے تعاون کی ضرورت ہے ۔ میری گذارش ہے کہ اپنے زرین مشوروں سے ہماری ہمت افزائی فرمائیں ۔

محمد خواجہ مجیب الدین

محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

www.urduacademyts.com

جدید تدریسی تقاضے اوراساتذہ کی اخلاقی و پیشہ وارانہ ترجیحات

تدریس صرف پڑھنے پڑھانے، لکھنے لکھانے، سیکھنے سکھانے یا پھر معلومات کی ترسیل کا نام نہیں ہے۔ یہ علم و افکار کی تبلیغ و ترویج کا ایک مقدس وسیلہ ہے۔ تدریس کی حیثیت جب ایک پیشہ سے زیادہ باقی نہ رہے تب تبلیغ وترویج جیسی اہم ترجیحات بھی نام نہاد معلومات کی ترسیل کی نذر ہو جاتی ہیں۔ تدریس کو صرف نوکری سمجھنے والے اساتذہ کے درمیان آج بھی ایسے کئی دیانت دار اساتذہ موجود ہیں جن کے دم سے درس و تدریس کا امتیاز اور وقار باقی ہے۔ تدریس ایک پیشے کا نام نہیں بلکہ مختلف علوم، صلاحیتوں اور استعداد کے مجموعہ و یکجائی کا نام ہے۔ درس و اکتساب پر معاشرے کے بدلتے مزاج اور جدت طرازیوں کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ آج درس واکتساب ہی نہیں بلکہ زندگی کے بیشتر شعبے ٹیکنالوجی کے زیر اثر آچکے ہیں۔ جدید تدریسی تقاضوں کی تکمیل اور طلبہ کی ٹیکنالوجی سے رغبت کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ اساتذہ جدید ٹیکنالوجی کو اپنے روزمرہ کے تدریسی افعال کا لازمی حصہ بنائیں۔ کمرہ جماعت کی افادیت اور تاثیر میں مسلسل اضافے کے خواہش مند اساتذہ کے لیے تو درس واکتساب میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال اور بھی اہمیت کا حامل ہے۔

ٹیکنالوجی کو صرف ''سلکان کوٹنگ'' کی طرح استعمال کرنے کے بجائے اساتذہ اسے طلبہ سے بہتر روابط ہموار کرنے اور ان کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے موثر طریقے سے بروئے کار لائیں۔ تدریس میں ٹیکنالوجی کے استعمال سے میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ جس طرح سالہا سال سے روایتی کاپی پیسٹ کے طریقے ہمارے زیر استعمال رہے ہیں، اسی طرح جدید ٹیکنالوجی کو بھی روایتی انداز (کاپی پیسٹ) میں مزید آگے بڑھایا جائے۔ جس طرح پاور (طاقت وعہدے) کا نشہ سیاست دانوں کو کرپٹ (مغرور و بدقماش) کردیتا ہے، پاور پوائنٹ کا بے جا اور خراب استعمال بھی اساتذہ اور ان کی تدریس کو بے اثر کردیتا ہے۔ تدریس خاص طور سے اس وقت اور بھی بے وقعت ہوجاتی ہے جب اساتذہ کے پاس سلائیڈز تو موجود ہوں لیکن وہ ان سلائیڈز کی وضاحت اور تشریح سے قاصر رہیں۔ ٹیکنالوجی (پاور پوائنٹ و دیگر ای مواد) کو تحصیل، تفہیم اور ترسیل علم کا واحد و حتمی ذریعہ سمجھنے کے بجائے اساتذہ اسے تحصیل، تفہیم اور ترسیل علم کے کارگر وسیلوں میں سے ایک وسیلہ ہی تصور کریں۔ ٹیکنالوجی کے ذریعے تدریسی امور کو موثر و مثبت بنانے کے لیے ٹیکنالوجی سے مربوط نئے تدریسی امور و زاویوں پر نہ صرف سنجیدگی سے غور وخوض کی ضرورت ہے بلکہ انھیں تدریسی افعال میں عملاً نافذ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

ڈیجیٹل درسیات کی تیاری و تدوین، ٹیکنالوجی کے

تعلیم و تدریس

www.urduacademyts.com

جال میں گرفتار آج کے معاشرے میں اور بھی اہمیت اختیار کرجاتی ہے۔اساتذہ کوخود اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ جہاں، دنیاانٹرنیٹ کے ترسیلی جال میں سمٹ کرایک چھوٹی سی بستی کی شکل اختیارکرچکی ہے، وہاں بچوں کے درس واکتساب کے کارگر وسیلے اورطریقہ کار کیا ہوں گے۔نصابی کتب اوراسباق کی ڈیجیٹل پیش کش (جس پرآج ہم تکیہ کیے ہوئے ہیں) یہ درس واکتساب کوکامیاب بنانے کے لیے ناکافی ہیں۔ طلبہ کے تعلیمی واکتسابی تسلسل کو مجروح کیے بغیران کی تخلیقی صلاحیتوں کو بہترمہمیز کرنے والے ڈیجیٹل پلاٹ فارمس ووسائل کی فراہمی درسیات، مواد، تکنیک اورطریقوں کی تخلیقی صورت گری نہایت ضروری ہے۔ہم روایتی کمرہ جماعت سے بلاک بورڈ کی جگہ اسمارٹ بورڈ کی تنصیب، چاک اور ڈسٹر کے بجائے اسمارٹ ٹیچنگ ٹولس کو رواج دے کر ہرگز مطمئن نہیں ہوسکتے ہیں کہ ہمارے کلاس رومس اسمارٹ ہوچکے ہیں۔ بھلاصرف ٹیکنالوجی وٹیکنالوجیکل ٹولس کی فراہمی سے روایتی کلاس روم، اسمارٹ کلاس رومس میں کیسے تبدیل ہوسکتے ہیں۔بچوں میں جان ہوتی ہے۔ان میں محبت، نفرت کی پہچان پائی جاتی ہے۔وہ بےحس وبےجان نہیں ہیں۔ان کے اندرعقل، دانش، غیرت وحمیت، خوشی، مایوسی، رنج وغم، دوستی، دشمنی، سودوزیاں جیسے مختلف جذبات پائے جاتے ہیں۔ کمرہ جماعت کولاکھ جدید تدریسی ٹیکنالوجیکل ٹولز (ٹیکنالوجی آلات) سے آراستہ وپیراستہ کردیا جائے، اساتذہ جب تک بچوں کی اکتسابی انفرادیت کوملحوظ نہیں رکھیں گے، یہ ٹولس بچوں میں تحریک وترغیب پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوں گے۔ اساتذہ جب تک بچوں کے جذبات واحساسات کی قدر نہیں کریں گے بچے درس واکتساب کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔کیابےجان آلات وٹولس، جان دار بچوں کی نفسیات کو سمجھ سکتے ہیں؟۔

روایتی کمرہ جماعت، جدید تعلیمی ٹولس وٹیکنالوجی سے نہیں بلکہ اساتذہ کی شفقت، محبت، دیکھ بھال، احساس ذمہ داری اوران کی ترجیحات سے اسمارٹ کلاس روم میں تبدیل ہوگا۔اساتذہ جدیدٹیکنالوجی اورجدید تعلیمی ٹولز پرہی اکتفانہ کریں بلکہ بچوں کی نفسیات و جذبات سے کماحقہ واقفیت حاصل کرتے ہوئے ان کے قلب و ذہن میں گھر بنائیں تاکہ ان کی تدریس اسمارٹ کہلائے۔مچھلی کے شکار کے لیےگل پرکیچوے لگائے جائیں گےتوہی مچھلیاں پکڑی جائیں گی۔کیچوں یا آٹے کے لدوں کے بجائے لکڑی کے ٹکڑے یاپھر کچھ اورلگائیں گےتو یہ عمل بےسودثابت ہوگا اور کوئی مچھلی ہاتھ نہیں لگے گی۔یاد رہے! آپ کا سامنا کسی روبورٹ سے نہیں بلکہ اشرف المخلوقات سے ہے۔

درس و تدریس میں ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ نئی صورت حال سے نبردآزمائی کے لیے ہمیں ایسی درس گاہوں کی ضرورت ہے جو تخلیق، ایجاد اور دریافت کو فروغ دے۔جدیدیت سے پیدا شدہ افراتفری پرحکمت و دانائی سے قابو پائے۔ جہاں کمزور روایات کی اصلاح ہو۔متناسب ومکمل شخصیت کی تعمیر ہو۔جدید طریقہ تعلیم سے مراد صرف

www.urduacademyts.com

درسیات (Pedagogy) کی تبدیلی ہی نہیں بلکہ ایک منفرد معیاری، سائنسی نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کو تعلیم میں ٹیکنالوجی کے استعمال اور تعلیمی ٹیکنالوجی سے متعلق اپنے افکار و نظریات میں مثبت تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔

آج ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جہاں ہر منٹ کوئی نہ کوئی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ ایک منٹ میں انگنت ٹوئٹس کیے جاتے ہیں۔ فیس بک پیج یا کسی دوسرے سوشل میڈیا پلاٹ فارم پر ہر منٹ بے شمار ناظرین اپنی حاضری درج کرواتے رہتے ہیں۔ سوشل میڈیا کے مختلف تعلیمی پلاٹ فارمز ترسیل علم میں نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ اسکول اور کمرہ جماعت میں پیئر لرننگ جس طرح فروغ اکتساب میں معاون ثابت ہوتی ہے، ٹیکنالوجی بھی پیئر لرننگ کی طرح طلبہ کو ایک خود کار اکتسابی کلچر (اسکیو مارفزم Skeuomorphism) فراہم کرتی ہے، جہاں طلبہ کسی تحدید و بندش کے بغیر تعلیمی نظام سے تعامل و ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے مسلسل سیکھتے رہتے ہیں۔ اس طریقہ کار کو ماہر تعلیم ڈونالڈ نارمیان (Donald Norman) نے اسکیو مارفزم سے تعبیر کیا ہے۔ جدید تعلیمی دنیا میں اسکیو مارفزم تیزی سے مقبولیت حاصل کرنے والی ایک خاص اصلاح ہے۔ ڈونالڈ نارمیان اس اکتساب کو تمام تحدیدات و بندشوں سے ماوراء قرار دیتا ہے۔ اسکیو مارفزم ایک ایسے تعلیمی ماحول کو وجود میں لاتی ہے جس کے زیر اثر طلبہ ایک خاص تعلیمی ماحول میں ٹیکنالوجی کی مدد سے از خود سیکھنے لگتے ہیں۔

برمنگھم یونیورسٹی کے ماہر تعلیم ڈین اوہارا (Dan O'Hara) کے مطابق اسکیو مارفزم تکنیک، ٹیک انڈسٹری میں صرف چند سالوں سے ہی استعمال کی جارہی ہے۔ اُن کے مطابق اسکیو مارفزم کوئی ایسی شئے نہیں ہے کہ جسے ڈیزائین کیا جائے بلکہ یہ مخصوص تعلیمی ماحول اور ٹیکنالوجی کے تعامل سے از خود انجام پانے والا اکتساب ہے۔ سہل انداز میں اسے ماحول کے ذریعہ اکتساب کا نام دیا جاسکتا ہے۔ انسانوں کے اندر موجود جمالیاتی حس، جس طرح انہیں حسن و قبیح کا احساس دلاتی ہے، اسکیو مارفزم بھی ایک خاص تعلیمی نظام میں ٹیکنالوجی سے مل کر از خود اکتساب کو فروغ دیتی ہے۔

فِلکر Flickr (فلکر ڈاٹ کام) پر رکھی گئی لاتعداد تصاویر اکتساب کے آفاقی معیار کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ اکتسابی عمل میں اہمیت کی حامل ہیں۔ ایپل اسٹور پر ہر منٹ میں 47000 سے زیادہ ایپس ڈاؤن لوڈ کئے جاتے ہیں۔ اس بات سے تشنگان علم کی علمی پیاس کی شدت اور حصول علم کی نئی جہات کا اندازلگایا جاسکتا ہے۔ 2004 سے قبل اس طرح کی سہولیات دستیاب نہیں تھیں۔ آن لائین ڈیٹا کی دستیابی نے سیکھنے کے خواہش رکھنے والے افراد کو بہت تیزی سے اپنی جانب راغب کیا ہے۔ ٹیکنالوجی نے سیکھنے والوں کو بیک وقت کئی مہارتوں اور استعدادوں کی نہ صرف معلومات بہم پہنچائی ہیں بلکہ انھیں عبور سے بھی ہمکنار کیا ہے۔ آن لائین ڈیٹا نے ایک آدمی، ایک کام کے نظریے کو مات دے کر آدمی کو کثیر الجہات بنادیا ہے۔

www.urduacademyts.com

تیزی سے بدلنے والی دنیا میں یہ ایک بڑی تلخ حقیقت ہے کہ اسکولوں میں سالہا سال سے کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔آج بھی اسکولوں میں روایتی انداز میں یا پھر نمائشی طور پر ٹیکنالوجی کو جگہ دی گئی ہے۔یہ بھی سچ ہے کہ ٹیکنالوجی پر مبنی طریقہ تدریس کے ناکام تجربات کی بھی کئی رپورٹس منظر عام پر آچکی ہیں۔

"Failed iPad Experiment Shows BYOD Belongs in Schools."

"LA,Cancles iPads in the schools' program,a failure of vision, not technology.

اسکولوں میں کثیر سرمایہ کاری کے باوجود ایسا محسوس ہورہا ہے کہ ٹیکنالوجی کو مدارس میں نافذ کرنے کے ہمارے منصوبے،طریقے اور حکمت عملیاں ناکام ہوگئی ہیں۔حقائق کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ تعلیم اور تعلیمی اداروں میں ٹیکنالوجی کے نفاذ میں ناکامی ٹیکنالوجی کی ناکامی نہیں بلکہ ہمارے تعلیمی نظام،تعلیمی منصوبہ بندی،تعلیمی نصاب، درسیات،اور تعلیمی طریقہ کار کی ناکامی ہے۔

بحیثیت معلم ہماری غلطیوں میں ایک اہم غلطی کاپی پیسٹ (نقل،چسپاں) ہے۔Ctrl+C اور Ctrl+V سے اکتسابی و درسیاتی مسائل کا حل ناممکن ہے۔خاص طور پر اس طرح کے عمل سے مسائل اور بھی پیچیدہ اور پریشان کن بن جاتے ہیں۔کاپی پیسٹ کا غلط استعمال اسکولوں میں ٹیکنالوجی کے نفاذ کے دوران ریکارڈ کی گئی غلطیوں میں سے ایک نمایاں غلطی کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔

مذکورہ مباحث کی روشنی میں ایک نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ صورت حال میں تدریسی منظر نامے کو بڑی حد تک تبدیل کرنا بے حد ضروری ہے۔بنیادی تدریسی اصولوں میں تبدیلی کے لیے ایک فعال تدریسی نمونہ و ماڈل کی ضرورت ہے تاکہ کاملیت کے حصول کے سفر میں ہمیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔اساتذہ کو جامع تعلیم (Holistic Education) کی حمایت میں آگے آنا چاہیے۔جامع تعلیم کی فراہمی سے سیکھنے والوں کی اکتسابی عادات میں فرق پیدا ہوگا بلکہ شرح اکتساب میں بھی خوش گوار تبدیلی واقع ہوگی۔

کمرہ جماعت کی اکتسابی سچائیوں میں ایک سچائی یہ بھی ہے کہ طلبہ جس استاد کو پسند کرتے ہیں اس کے مضمون کو بھی پسند کرتے ہیں۔باالفاظ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ طلبہ اسی مضمون کو پسند کرتے ہیں جس کی تدریس ان کے پسندیدہ اساتذہ انجام دیتے ہیں۔اس حقیقت کے پیش نظر اساتذہ کے پاس طلبہ کی فلاح و بہبود پر مبنی ایک مبسوط روزمرہ کا واضح منصوبہ ہونا چاہیے۔اس منصوبے سے طلبہ نہ صرف کامیابی کی سمت جست لگائیں گے بلکہ ان کی اکتسابی مسرت کے اشاریے میں بھی نمایاں ترقی ریکارڈ کی جائے گی۔

درس واکتساب کے تشویشناک پہلوؤں میں اساتذہ کے لیے جو سب سے زیادہ تشویش کا پہلو ہے وہ درحقیقت کمرہ جماعت کا انتظام وانصرام (Classroom

www.urduacademyts.com

(Management) ہے۔اساتذہ اگر طلبہ سے محبت و شفقت سے پیش آتے ہیں تو کلاس روم کا انتظام بدنظمی و بھونڈے پن سے محفوظ رہے گا۔ بیشتر اساتذہ کمرہ جماعت کے انتظام وانصرام کو صرف نظم وضبط کے زاویہ سے ہی دیکھتے ہیں۔ان کے نزدیک کمرہ جماعت کے انتظام وانصرام سے مراد جماعت میں طلبہ کو خاموش رکھنا ہے۔ کمرہ جماعت کا انتظام و انصرام درحقیقت تدریسی اہداف کا حصول، تدریسی طریقہ کار وتکنیک کا اطلاق، مثبت تدریسی افعال، تدریسی محاصل پر نگاہ اور طلبہ کے اکتساب کی رفتار وترقی کی نشاندہی وغیرہ سے منسوب ہے۔

سینئر اساتذہ خاص طور پر کمرہ جماعت کے تصور کو وسیع تناظر میں دیکھیں۔ اپنے ساتھی اساتذہ کو کمرہ جماعت کے کامیاب انتظام و انصرام پر مبنی ایک واضح فریم ورک (عملی منصوبہ) فراہم کریں، تاکہ وہ اپنے کمرہ جماعت کے انتظام و انصرام کا موثر منصوبہ ترتیب دیں۔طلبہ کو درسی سرگرمیوں میں مصروف رکھتے ہوئے کچھ وقت کے لیے تو کمرہ جماعت کے انتظام و انصرام کو بحال رکھا جاسکتا ہے۔لیکن ایک فعال کمرہ جماعت کے (کلاس روم) کے قیام کے لیے اساتذہ کا مشفقانہ رویہ، ہمدردانہ طرز عمل، طلبہ، اساتذہ کے مابین خوش گوار تعلقات بہت اہم ہیں۔ ایک بے جان خیالی منصوبہ کمرہ جماعت کے انتظام و انصرام کے لیے کافی نہیں ہے ۔ کمرہ جماعت کے انتظام و انصرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ایک حقیقی (فزیکل/عملی) مبسوط، جامع، فعال ومتحرک منصوبے کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔

اساتذہ کے لیے پیشہ وارانہ ضابطہ اخلاق ضروری ہے جو نہ صرف ان کی اساسی ذمہ داریوں کا احاطہ کرتا ہو بلکہ طلبہ کی زندگی میں ان کے کردار، معنویت اور اہمیت کو بھی وضاحت سے پیش کرتا ہو۔تدریسی پیشہ وارانہ ضابطہ اخلاق سے اساتذہ کی تدریس سے وابستگی و بلند عزائم ،درس واکتساب کے اہداف کے حصول میں ان کی فعال شرکت داری سے ظاہر ہونا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ جو شخص بھی تدریس کو ایک پیشہ کے طور پر اپنانا چاہتا ہے وہ خود کو مثالی تدریسی نظریات (ٹیچنگ آئیڈیلس) کے مطابق ڈھال لے۔اساتذہ کو ہر پل یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ استاد معاشرے کا ایک باوقار اور معتبر فرد ہی نہیں ہے بلکہ ہر گھڑی اس پر اس کے شاگردوں اور معاشرے کی نگاہیں گڑی رہتی ہیں۔ پیشہ تدریس اسی لیے تقاضا کرتا ہے کہ استاد پرسکون ،صابر مزاج، ملنسار، ہمدرد، مونس وغم خوار، بہتر سامع اور اچھی و بہتر گفتگو کرنے والا ہو۔ان صفات کو اپنی ذات میں پیدا کرنے کے لئے اساتذہ کو شب روز سال کے بارہ مہینے عملی مشقتوں ومجاہدوں سے گزرنا پڑتا ہے۔اسی وجہ سے استاد کو سماج میں عزت وعظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

☆☆☆

17-1-30/42، شمس کالیج، روبرو غفاریہ مسجد،
سنتوش نگر واٹر ٹینک روڈ، حیدرآباد۔ 500 023
Cell: 9700122826

www.urduacademyts.com

تخلیقی تحریر کی صلاحیت

زبان کی تدریس کا عام مقصد زبان کی بنیادی مہارتوں (سماعت، گفتگو، مطالعہ اور تحریر) کا فروغ ہے۔ کسی زبان کو جاننے اور اس میں خاطر خواہ صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ان مہارتوں کی تحصیل ضروری ہے۔ مادری زبان کی تدریس کے دوران طلبا میں ان ہی چاروں مہارتوں کی حصولیابی کی کوشش کی جاتی ہے۔ زبان کی چار بنیادی مہارتوں میں سے ایک تحریر ہے۔ تحریر لسانی اصطلاح میں ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے انسان علامتوں یعنی حروف اور الفاظ کی مدد سے اپنے خیالات کا لکھ کر اظہار کرتا ہے۔ یہ اظہار کاروباری بھی ہوتا ہے اور تخلیقی بھی، یہ تہذیبی زندگی کا مظہر بھی ہوتا ہے اور شخصیت سازی کا ذریعہ بھی۔ اس لیے تحریری صلاحیت کی آموزش کی زبان میں کلیدی حیثیت ہے۔ تحریر انسانی تجربات و محسوسات اور خیالات و افکار کے اظہار کا بہت موزوں، مناسب اور موثر وسیلہ ہے۔ انسان اپنے خیالات، مشاہدات اور معلومات کو تحریری شکل دے کر مستقبل میں خود فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اسے محفوظ کر کے آنے والی نسلوں کے لیے بھی علم کا خزانہ چھوڑ سکتا ہے۔ زبان پر عبور حاصل کرنے کے لیے بچوں کو تحریر میں مہارت حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔

زبان کی تدریسی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد طلبا میں تخلیقیت کو فروغ دینا بھی ہے۔ تخلیقیت کے فروغ کے مؤثر طریقوں میں سے ایک طریقہ تخلیقی تحریر ہے جو تخلیقی انداز میں اظہار ذات کا موقع فراہم کرتی ہے۔ تخلیقی اظہار کے فروغ کے لیے تخلیقی تحریر بہت کارگر طریقہ ہے کیوں کہ تحریر میں تخلیقیت کے تمام عناصر شامل ہوسکتے ہیں۔ تخلیقی تحریر ایک ایسا عمل ہے جو تخلیق کار کو خیالات و تجربات دریافت کرنے، مربوط کرنے اور انھیں نئے تناظر میں دیکھنے کا اہل بناتی ہے۔ یعنی تخلیقی تحریر خود اپنے نیز دوسروں کے بارے میں سوچنے اور سیکھنے کا ایک تخلیقی عمل ہے۔

تخلیقی تحریر کے عملی اقدامات:

طلبا میں تخلیقی تحریر کی صلاحیت کو فروغ دینے کے لیے کچھ عملی اقدامات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ انھیں اقدامات کی روشنی میں معلم طلبا میں تخلیقی تحریر کی صلاحیتوں کو فروغ دے سکتا ہے۔

طلبا کو آزادی سے اظہار کی اجازت دینا: اکثر طلبا کو اپنے ذاتی خیالات اور احساسات کو صحیح ڈھنگ سے اظہار کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ اس بات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے کہ طلبا اپنے احساسات کا اظہار بلا تکلف کریں۔ بنیادی طور پر اعتماد اور قبولیت کے ماحول میں ہی تخلیقیت پروان چڑھتی ہے۔ تخلیقی تحریر خود انکشافی کا تقاضا کرتی ہے اس لیے طلبا کو اس بات کا یقین ہونا چاہیے

www.urduacademyts.com

کہ دوسرے ان کے دلی جذبات کی پذیرائی کریں گے۔ تخلیقی تحریر کے فروغ میں سازگار ماحول اور استاد کا اہم رول ہوتا ہے۔ معلم کو چاہیے کہ طلبا کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار میں پوری آزادی ملے۔

طلبا کو خود احتسابی کی اجازت دینا: معلم کو چاہیے کہ طلبا میں خود احتسابی کے عمل کی حوصلہ افزائی کرے۔ اس کے لیے طلبا اپنے تجربات کے بارے میں بات چیت کریں، انھیں جانچیں۔ نیز دوسرے طلبا کے تجربات سے اپنے تجربات کا موازنہ بھی کریں۔

تحریر کے عمدہ نمونوں کی فراہمی: تحریر کے سلسلے میں حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ اچھی تحریروں کے نمونوں کے ذریعے سکھانا بھی کارگر طریقۂ تدریس ہوسکتا ہے۔ معلم ادبا و شعرا کے تخلیقی نمونوں کو طلبا کو دِکھائیں اور ان پر بات چیت بھی ہو۔ طلبا ان تحریروں کا بغور مطالعہ بھی کریں۔ اس طرح معلم طلبا میں تخلیقی تحریر کی صلاحیت کو فروغ دے سکتے ہیں۔

اصولوں اور فنی نمونوں کی تعلیم دینا: طلبا کو تخلیقی تحریر کے لیے اصولوں اور فنی نمونوں سے بھی واقف کرانا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک بہتر طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی ادب پارے پر طلبا اپنے ردعمل کا اظہار کریں۔ ادب پارے کی فنّی اور لسانی خصوصیات کی شناخت میں استاد طلبا کی رہنمائی کریں۔ طلبا کو اس بات کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ ان تحریروں میں ہیئت اور پیش کش پر نظر رکھیں اور اپنی تحریروں میں ان کو برتنے کی کوشش کریں۔

طلبا کو مناسب فیڈ بیک فراہم کرنا: اگر طلبا کی تحریری صلاحیتوں میں بہتری کے لیے معاونت مقصود ہو تو جہاں طلبا کی تخلیقی تحریر پر اپنے ردعمل کا اظہار کرنا اہم ہے، وہیں ان کو مناسب فیڈ بیک فراہم کرنا اور حوصلہ افزائی کرنا بھی ضروری ہے۔ طالب علم کی تحریر پر مفید اور قیمتی فیڈ بیک دوسرے ہم جماعتوں کی رائے ہوسکتی ہے۔ طلبا ان فیڈ بیک کی بنیاد پر اور مسلسل مشق کے ذریعے اپنی تخلیقی تحریر کو بہتر کرسکتے ہیں۔

تخلیقی تحریر کے امور: کمرۂ جماعت میں معلم کی تدریس کا مقصد طلبا کی تخلیقی صلاحیتوں کو باہر نکالنا ہے۔ تخلیقی اظہار کی صلاحیت طلبا میں فطری ہوتی ہے اور اس صلاحیت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے مشق اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان و ادب کی تدریس کے دوران استاد طلبا میں تحریری مہارت کو فروغ دینے کے لیے ان کی رہنمائی کرسکتا ہے، اور مختلف طرح کی سرگرمیاں انجام دے سکتا ہے۔ اگر ان سرگرمیوں کی طرف ٹھیک طرح سے توجہ دی گئی تو طلبا میں تحریری مہارت کی صلاحیت میں اضافہ ہوسکتا ہے اور ان میں تخلیقی تحریر کی صلاحیت میں نکھار آسکتا ہے۔ طلبا میں تخلیقی تحریر کی مہارتیں پیدا کرنے کے لیے درج ذیل سرگرمیوں پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے:

کہانی یا حکایات: کہانی عام طور پر کسی شخص، واقعے، منظر یا صورتِ حال کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ بعد ازاں

www.urduacademyts.com

اس میں مختلف واقعات کو جوڑ دیا جاتا ہے۔ ایک کڑی سے دوسری کڑی اس طرح جوڑی جاتی ہے کہ تسلسل اور منطقی ربط برقرار رہے۔ طلبا کو کسی بھی واقعے پر کہانی لکھنے کی طرف راغب کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے معلم کو طلبا کی ذاتی سعی و کاوش سے کام لینا چاہیے۔ مناسب سوال و جواب کی مدد سے کہانی کے تمام اہم نکات اور ضروری پہلو زیر بحث لائے جاسکتے ہیں۔ کہانی کی درج ذیل شکلیں ہوسکتی ہیں:

تصویری کہانی: تصویری کہانیوں میں واقعات کے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ ان مناظر کے جو نقوش ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں وہ انمٹ اور دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔ طلبا کی تخلیقی قوتوں کو اجاگر کرنے اور مناسب تربیت کے مواقع فراہم کرنے کے لیے تصویری کہانی کا استعمال ناگزیر ہے۔ ان تصاویر کی مدد سے طلبا آسانی سے کہانی مرتب کرسکتے ہیں۔ اس عمل کے لیے تصاویر ہمیشہ بچوں کی ذہنی سطح اور استعداد کے مطابق ہونی چاہئیں۔ اگر تصاویر زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہوں تو طلبا آسانی سے ان کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے اور کہانی کے مختلف پہلو اور اہم کڑیاں نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ معلم ان تصاویر پر فکر انگیز سوالات قائم کرکے مواد فراہم کرسکتے ہیں۔ طلبا کے جوابات کو مکمل فقروں کی صورت میں تختۂ سیاہ پر لکھا جائے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ چند اشارات ہی درج کیے جائیں تاکہ طلبا جملے خود بنائیں۔ طلبا کے ذریعے لکھی تصویری کہانیوں کی اصلاح معلم کرے اور جماعت میں پڑھ کر بھی سنائے۔ کبھی کبھی اس طرح کی کہانی لکھنے کے مقابلے کا اہتمام کریں اور اچھی کہانی پر طلبا کو انعام سے بھی نوازیں۔ اس طرح کے عمل سے طلبا میں خاطر خواہ تحریری مہارت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

کہانی کی دوسری صورت نامکمل کہانیاں ہیں۔ اس میں کہانی کا ابتدائی حصہ صحیح طریقے سے لکھا ہوتا ہے مگر بعد کے حصے پر نہ اشارات دیے جاتے ہیں نہ ہی تفصیل سے کہانی لکھی ہوتی ہے۔ طلبا اس نامکمل حصے کو خود تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ معلم جس قدر طلبا میں تخلیق کے لیے حوصلہ افزائی کریں گے طلبا اس قدر اچھے لکھنے والے بنیں گے۔ ایسی تحریر کے لیے ضروری ہے کہ معلم بچوں کو مناسب ماحول عطا کریں جس میں طلبا آزادئ فکر سے اپنے صلاحیتوں کا مظاہرہ کرسکیں تاکہ اُن میں شعر و ادب تخلیق کرنے کا شوق پروان چڑھ سکے۔

خلاصہ نگاری: درسی کتاب میں پڑھی ہوئی کہانی، حکایات اور نظم کو طلبا سے اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ کسی کہانی کا خلاصہ کرنا اور اپنے الفاظ میں مختصر طریقے سے بیان کرنا ایک اچھی تحریری مشق ہے۔ پڑھائے گئے اسباق کو مختصر مگر جامع الفاظ میں لکھنے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ اس میں نظم کے مرکزی خیال اور شاعر کے جذبات و احساسات کو بھی لکھوایا جاسکتا ہے۔ اس میں طلبا سبق کی تفہیم کے مطابق اپنی زبان میں اختصار کے ساتھ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معلم کو چاہیے کہ سبق پڑھانے کے بعد طلبا کو ہدایت دیں اور سبق کا خلاصہ لکھنے کو

www.urduacademyts.com

کہیں۔اس عمل سے طلبا کی تخلیقی تحریر کی مہارت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

نظم: نظم شاعری کی ایک ایسی قسم ہے جس میں ربط و تسلسل ہوتا ہے۔ ہر نظم کا کوئی ایک عنوان ہوتا ہے۔نظم زندگی کے کسی بھی واقعے، مسئلے، خیال، جذبے اور مشاہدے کو بنیاد بنا کر لکھی جاتی ہے۔اسے لکھنے میں عام طور پر بحر اور وزن کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ شعر میں نغمگی، صنائع و بدائع کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک عمدہ اور موثر و مربوط نظم ذہنوں کو جھنجھوڑ سکتی ہے۔تجربے اور جذبات کی شدت سے نظم تخلیق ہوتی ہے۔ اس کے لیے فطری میلان کے ساتھ الفاظ کے صحیح انتخاب کی مہارت بھی ضروری ہے۔ ثانوی جماعت کے طلبا کو مختلف موضوعات پر نظم لکھنے کی ترغیب دی جاسکتی ہے۔اس عمل سے طلبا کے تخلیقی تحریر کی صلاحیت میں نکھار آئے گا۔

مضمون نگاری: کسی بھی موضوع یا مسئلے پر معلوماتی یا تجزیاتی نثری تحریر کو مضمون کہتے ہیں۔مضمون بنیادی طور پر کسی ایک موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔مضمون کی کامیابی کا انحصار ربط و ترتیب اور تنظیم کی خوبی پر ہے۔ مضامین کا انتخاب طلبا کی ذہنی استعداد کے مطابق ہونا چاہیے۔ ابتدائی جماعتوں میں مضامین کے لیے موضوعات ان کے ماحول سے لیے جائیں،ایسے موضوعات جن پر بچے آسانی سے اظہار خیال کرسکیں۔ پسندیدہ جانور، جگہ اور اہم تہواروں کے بارے میں طلبا سے ان کے اپنے الفاظ میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھوائے جاسکتے ہیں۔ اعلی ابتدائی اور ثانوی سطح پر آہستہ آہستہ مضامین کے موضوعات میں تنوع ہونا چاہیے۔ اس سطح پر قومی رہنماؤں جذبۂ حب الوطنی، مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی والے مضامین شامل کیے جاسکتے ہیں۔ بعض اوقات خیالی مضامین بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔مثلاً اگر میں اسکول کا پرنسپل ہوتا، اگر مجھے ایک ہزار روپے مل جائیں تو کیسے خرچ کروں گا؟ وغیرہ۔ ہر قسم کے مضمون کے لیے ضروری ہے کہ طلبا ان موضوعات پر خود سوچیں، معلومات جمع کریں، ان کو مناسب ترتیب دیں اور پھر دلچسپ پیرائے میں بیان کرنا شروع کردیں۔ ہر اچھے مضمون کی چند خصوصیات ہیں،جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً تمہید، نفس مضمون اور اختتام۔مضمون نویسی میں طلبا اپنے خیالات، معلومات، جذبات و احساسات کو ربط و تسلسل کے ساتھ مناسب پیرائے الفاظ اور جملوں کو استعمال کرتے ہوئے مضمون لکھنے کی مشق کریں تاکہ ان میں تحریری مہارت کے ساتھ تخلیقی تحریر کی صلاحیت کا بھی فروغ ہوتا رہے۔ جماعت میں مضمون نویسی کی تدریس پر خاص توجہ دی جانی چاہیے۔

مکتوب نگاری: خط لکھنا پیغام رسانی کا اہم ذریعہ ہے۔ خط نگاری ایک دوسرے کو اپنی خیر و عافیت اور جذبات و احساسات سے واقف کرانے کا فن ہے۔ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مکتوب نگاری کی خاص اہمیت

www.urduacademyts.com

ہے۔ اس میں دفتری، کاروباری خطوط، دعوت نامے اور درخواستیں شامل ہیں۔ مکتوب نگاری کا نصاب طلبا کی ذہنی استعداد اور عملی ضرورت کے مدنظر ترتیب دیا جائے۔ خطوط نگاری کو حقیقی زندگی کے ساتھ مربوط کرنے کی ضرورت ہے۔ ابتدائی سطح کی جماعتوں سے ہی طلبا میں خطوط لکھنے کی عادت ڈالی جاسکتی ہے۔ طلبا کو اس سطح سے ہی خطوط لکھنے کے لیے اچھی مشقیں فراہم کرنی چاہئیں۔ علاوہ ازیں اعلی ابتدائی اور ثانوی سطح تک یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ معلم کو چاہیے کہ خطوط کے کچھ نمونے طلبا کو دکھائے اور پڑھ کر بھی سنائے۔ طلبا سے اپنے دوست، والدین، عزیز و اقارب وغیرہ کو خط لکھنے کے لیے کہا جائے۔ درخواست کی ضرورت طلبا کو تعلیمی اداروں اور ان کی زندگی میں بھی ہوتی ہے۔ اس لیے معلم کو مکتوب نگاری پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اگر ان سرگرمی کا اہتمام صحیح طریقے سے کیا جائے تو طلبا کی تحریری مہارت میں پختگی آئے گی۔

رپورتاژ: کسی ادبی جلسے، واقعے، مجلس وغیرہ پر جو روداد لکھی جاتی ہے اسے رپورتاژ کہتے ہیں۔ رپورتاژ نگار تفصیلات اور جزئیات کے ذریعے قاری کے سامنے متحرک تصویروں کا سماں باندھ دیتا ہے۔ رپورتاژ صرف چشم دید واقعات پر لکھا جاتا ہے۔ اس میں واقعات کی صداقت کے ساتھ جذبات و تاثرات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی لیے رپورتاژ نگار کو کسی واقعے، حادثے، ادبی جلسے، مشاعرے، کانفرنس وغیرہ کو ذاتی طور پر دیکھنا اور اس کی صحیح تصویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار کرنا بھی لازمی ہے۔ رپورتاژ کی زبان صاف، شستہ اور رواں ہونی چاہیے۔ طلبا کو شروع سے ہی رپورتاژ لکھنے کی جانب راغب کرنے کے لیے اسکول کے جلسوں اور مختلف تقریبات کی روداد لکھنے پر آمادہ کیا جانا چاہیے۔

ڈائری: ڈائری کو اردو میں روزنامچہ کہتے ہیں جس میں روزمرہ زندگی کے اہم مشاغل، واقعات، تجربات یا محسوسات کو قلم بند کیا جاتا ہے۔ ڈائری میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی اہمیت کے واقعات بھی بیان کیے جاسکتے ہیں۔ ڈائری نگار اپنے گھریلو حالات، گرد و پیش کے اہم واقعات، کسی اہم علاقائی، قومی یا بین الاقوامی واقعے یا حادثے سے متعلق تفصیل اور اپنے ذاتی تاثرات بھی بیان کرسکتا ہے۔ ڈائری لکھنے والے کی دلچسپی، اس کے خیالات، تصورات اور شخصیت کا عکس اس کے ہر صفحے پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ تحریری مہارت کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں میں چھوٹی عمر سے ہی ڈائری لکھنے کی عادت ڈالی جائے۔ طلبا سے ان کی دن بھر کی اہم سرگرمیوں کو لکھنے کے لیے کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان سے ماضی کے اہم واقعات، کوئی حادثہ یا کوئی خاص تجربہ جو ان سے جڑا ہو، لکھنے کے لیے کہا جائے اور جب بچے لکھ لے تو معلم اس تحریر کی اصلاح کریں اور بچوں کی حوصلہ افزائی بھی کریں۔

نوٹس بورڈ: طلبا کو عام اطلاعات تحریر کرنے کی جانب متوجہ کرنا بھی ضروری ہے۔ طلبا کو اسکول میں منعقد ہونے والی

www.urduacademyts.com

تقریبات، تعلیمی وثقافتی مقابلوں، کھیل کود، پکنک اور امتحانات کے نظام الاقات کی اطلاع نوٹس بورڈ کے ذریعے دی جاتی ہے۔ نوٹس تحریر کرتے وقت الفاظ کے سائز، سطروں کے سیدھے ہونے، جملوں کی ساخت، اطلاع کی ترسیل اور اختصار پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں الفاظ اور سطور کی رنگ برنگی تزئین کو بھی اہمیت دی جانے لگی ہے۔ اس لیے بچوں میں نوٹس لکھنے اور پڑھنے کی عادت کو فروغ دینا لازمی ہے۔ معلم کو چاہیے کہ بچوں سے نوٹس لکھنے کی مشق کرائیں اور نوٹس بورڈ پر بھی لگائیں۔

اشتہار: آج کے ترقی یافتہ دور میں ملٹی میڈیا کے فروغ کے ساتھ اشتہارات کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ اشتہار تیار کرنا یا لکھنا بھی ایک مہارت ہے۔ ہم ٹی۔ وی، انٹرنیٹ، اخبارات اور رسائل میں ایسے اشتہارات دیکھتے ہیں جو فوراً ہمیں اپنی طرف راغب کر لیتے ہیں۔ کاروباری نقطۂ نظر سے اشتہارات کی بہت اہمیت ہے۔ تعلیمی درس گاہوں میں ہونے والی تقریبات کی تشہیر کے لیے بھی اشتہارات رائج ہو چکے ہیں۔ یہ اشتہارات دلچسپ، تخلیقی، پرکشش اور موزوں ہونے چاہئیں۔ اشتہار بہت کم الفاظ میں تیار کیے جانے چاہئیں اور ان میں تسلسل ہونا بہت ضروری ہے۔ معلم کو طلبا میں اشتہارات لکھنے اور تیار کرنے کی صلاحیت کو فروغ دینا چاہیے۔

معلم دیگر سرگرمیوں کے ذریعے بھی طلبا میں تخلیقی تحریر کی صلاحیت کا فروغ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر طلبا سے اسکول سے متعلق یا کسی واقعہ اور پروگرام سے متعلق رپورٹیں اور اہم خبریں لکھوانی چاہئیں۔ معلم مکالمے اور سوانح نگاری کی طرف بھی توجہ دے سکتا ہے اور طلبا سے کسی واقعے یا کہانی کے لیے چھوٹے چھوٹے مکالمے لکھوا سکتا ہے۔ بچے سوانحی حالات لکھنے میں بڑی دلچسپی دکھاتے ہیں۔ اس لیے طلبا کو ان کی ذہنی استعداد کے مطابق کسی چیز یا شخص کی سرگزشت یا سوانح لکھنے کو کہا جائے۔ مثلاً بچپن کے دن، جوانی کے حالت وغیر۔ ان سرگرمیوں سے طلبا میں تخلیقی تحریر کی مہارت میں اضافہ ہوتا ہے۔

درج بالا تحریری سرگرمیوں کا اہتمام معلم کو اکثر و بیشتر کرتے رہنا چاہیے اور طلبا کی شراکت کو زیادہ سے زیادہ لازمی بنانا چاہیے۔ یہ سب معلم پر منحصر کرتا ہے کہ وہ کب اور کیسے ان سرگرمیوں کو طلبا سے کرائے اور ان میں صحیح مشق اور تربیت سے تخلیقی تحریروں میں نکھار پیدا کرے۔ اگر طلبا ان سرگرمیوں کو کرتے ہیں تو ان کی تحریری مہارت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ ثانوی سطح پر اور اسکولی تعلیم کے بعد بھی طلبا اپنے خیالات، جذبات و احساسات، معلومات اور تجربات کو تحریری صورت میں بیان کریں گے تو ان کی تحریری مہارت کا فروغ ہوگا اور تخلیقی تحریر میں نکھار پیدا ہو سکے گا۔

☆☆☆

محمد ارسد انصاری
اسسٹنٹ پروفیسر، آئی۔ اے۔ ایس۔ ای۔
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
موبائل: 9911543984

www.urduacademyts.com

مفکر اسلام ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد ساز شخصیت

عالم ہست و بود بے شمار پھولوں کی مہک سے معمور ہوتا ہے۔ ہر پھول اپنی لطافت و نزاکت، خوشبو و مہک سے چمن کی زیب و زینت، آرائش و زیبائش کا جز بن جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات پھولوں کے تختوں میں کوئی پھول ایسا بھی کِھلتا ہے جس پر پورا چمن نازاں و متفخر ہو جاتا ہے۔ اِس ایک پھول کی مہک پورے چمن کے بہار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ دکن کی سرزمین بجا طور پر اپنی زرخیزی پر فخر کر سکتی ہے کہ اُس نے ڈاکٹر حمید اللہ جیسی شخصیت کو جنم دیا۔ علوم اسلامیہ کے بلند پایہ عالم، محقق، مترجم، مفسر، محدث، سیرت نگار، داعی و بین الاقوامی قانون کے ماہر ڈاکٹر محمد حمید اللہ عربی النسل نوایط خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی ولادت 16 /محرم 1326ھ مطابق 19 /فروری 1908ء چہار شنبہ کی رات کٹل منڈی کے مکان روبرو درگاہ حبیب علی شاہ میں ہوئی۔ اُن کے والد ابو محمد خلیل اللہ کو (جو قاضی بدرالدولہ کے فرزند تھے) فن تعلیم سے بے حد دلچسپی تھی۔ بچوں کے لیے اُنہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جو آج بھی کارآمد ہیں، حمید اللہ صاحب کی بسم اللہ کی تقریب کے بعد باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ مدرسہ دارالعلوم میں شریک کیے گئے' اُردو مڈل تک وہیں تعلیم پائی اور پھر جامعہ نظامیہ بھیج دیے گئے، تاکہ عربی پڑھیں۔ وہاں چند سال رہے پھر والد صاحب کی اطلاع کے بغیر مخفی طور پر صرف انگریزی کا امتحان دے کر میٹرک کامیاب کیا۔ اور جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ دینیات میں شریک ہوئے۔ یہیں سے بی-اے، ایم-اے، اور ایل ایل بی کے امتحانات اعزاز سے پاس کئے۔

ایم-اے کا امتحان اعزاز سے پاس کرنے پر وظیفہ تحقیقاتِ علمی ملا۔ اور ''اسلامی بین الممالک'' پر کام شروع ہوا۔ جب یہاں ان کے علم کی تشنگی دور نہ ہو سکی تو حجاز، لبنان، شام، فلسطین، مصر اور ترکی گئے۔ نومبر/1932ء میں بون یونیورسٹی جرمنی پہنچے اور جامعہ عثمانیہ کی اجازت سے اپنا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ پیش کر کے جولائی/ 1933ء میں ''عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری'' کے موضوع پر فرنچ میں مقالہ داخل کیا' جس پر انہیں ڈی لٹ کی ڈگری ملی۔ تیسری ڈاکٹریٹ ڈگری کے لیے روس جانا چاہتے تھے لیکن وظیفہ تحقیقات علمی ختم ہونے سے وہ 1935ء میں حیدرآباد واپس ہو گئے۔

اسی عرصہ میں جامعہ کے وہ ممتاز طلباء جو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجے گئے تھے، انہوں نے وہاں علمی میدان میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے اور اعزاز کے ساتھ اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے واپسی پر خود جامعہ کے زمرہ اساتذہ میں داخل ہو گئے۔ ان میں ڈاکٹر سید حسین (کیمیا) ڈاکٹر میر ولی الدین (فلسفہ) ڈاکٹر سعادت علی خان (قانون) پروفیسر صلاح الدین (فلسفہ) ڈاکٹر محمد حمید اللہ (دینیات) پروفیسر

www.urduacademyts.com

ضیاء الدین انصاری (انجینیر ی) پروفیسر محمد علی خان (طبیعیات) ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ (اُردو) ڈاکٹر جعفر حسن (عمرانیات) ڈاکٹر قاری کلیم اللہ (فارسی) اور پروفیسر ستیانارائن راو (طبیعیات) قابل ذکر ہیں۔

1935ء میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو حیدرآباد واپسی کے بعد جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں ملازمت مل گئی۔ پھر وہ کلیہ قانون جامعہ عثمانیہ میں قانون بین الممالک (انٹرنیشنل لا) پڑھانے لگے۔ ڈاکٹر میر سیادت علی صاحب کے محکمہ عدالت میں ترقی پر جانے سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو ان کی جگہ ریڈر کے عہدہ پر ترقی ملی۔ مولانا عبدالغفور رحمت آبادی کا بیان ہے:

''جب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو لا کالج میں قانون بین الممالک کی زائد کلاس کی ذمہ داری دی گئی تو آپ اس کلاس کو صبح آٹھ بجے لیتے تھے۔ یونیورسٹی میں یہ کلاس سب سے پہلے ہوتی تھی۔ اس لیے نامپلی سے یونیورسٹی چلنے والی بس جس سے ڈاکٹر صاحب بھی سفر کرتے تھے، پہلی بس ہوا کرتی تھی۔ کنڈکٹر کو ڈاکٹر صاحب کی ہدایت تھی کہ اس بس میں سوار طلبہ کو ٹکٹ دے کر پیسہ نہ لے سبھوں کے ٹکٹ کے پیسے ڈاکٹر صاحب ادا کرتے تھے۔

اس مضمون میں مولانا عبدالغفور رحمت آباد نے ایک اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب طلبہ میں صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے اپنا قیمتی وقت صرف کرتے تھے وہ اُن پر پیسہ خرچ کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب مجردگاہ (Bachelor's Building) تاریخی نام ''البیوت الاقامۃ المجردین'' ہے جو مادر دکن فنڈ کے لیے وقف ہے) کمرہ نمبر 115 اپنے نام پر کرایہ سے لیے ہوئے تھے اور وہ آپ کی نشست گاہ تھا۔ یہاں پر کئی طلبہ آپ سے مشورہ اور معلومات حاصل کرنے کے لیے اور اپنی مشکلات دور کرنے کے لیے آتے تھے۔ یہ کمرہ آپ کے پیرس جانے کے بعد بھی کئی دنوں تک آپ کے نام پر ہی تھا۔''

آج بھی مجردگاہ حیدرآباد میں معظم جاہی مارکیٹ کے روبرو ایک خوبصورت پانچ منزلہ بلڈنگ ہے۔

1947ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو نظام حیدرآباد نے مخصوص حالات میں اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔ حیدرآباد کی آزادی کی حفاظت کے لیے اس زمانے میں جو کوششیں ہوئیں ان میں سب سے بڑا قدم یہ تھا کہ صیانتی کونسل میں حیدرآباد پر ہندوستان کی جارحیت کے خلاف اپنا مقدمہ پیش کرنے پر ایک ایک وفد معین نواز جنگ کی قیادت میں پیرس بھیجا۔ اس وفد میں شیام سندر، ظہیر احمد، ڈاکٹر یوسف حسین خان، اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ شامل تھے۔ ظہیر احمد اس وفد کے سیکریٹری تھے۔ اس دوران جب ہندوستانی فوجوں نے ستمبر 1948ء میں ریاست حیدرآباد پر قبضہ کرلیا تو بدلے ہوئے حالات میں حضور نظام نواب میر عثمان علی خان سابع نے اس وفد کو واپس بلالیا۔ وفد کے ارکان واپس ہوگئے۔

www.urduacademyts.com

لیکن ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے واپسی سے انکار کرتے ہوئے یہ استدلال پیش کیا کہ مجھے ایک مقتدر حکمران نے اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا۔اب جو واپس طلب کیا گیا ہے وہ سیاسی دباؤ کے تحت ہے اس لیے انہوں نے حیدرآباد واپسی سے انکار کردیا۔

1948ء سے ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی مرضی سے پیرس میں ایک بے وطن اور پناہ گزین کی حیثیت سے سکونت اختیار کرلی۔آپ تقریباً بیس (20) سال تک پیرس کی نیشنل سنٹر آف سائنٹیفک ریسرچ سے وابستہ رہے۔ ساتھ ہی پیرس، جرمنی اور ترکی کی جامعات میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی ساری زندگی یورپ ایشیاء اور آفریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں صرف کردی۔ڈاکٹر حمید اللہ کی ساری زندگی اسلام کی تبلیغ اور نشر واشاعت میں گزری۔ ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ ''بلا مبالغہ میرے ہاتھ پر لاکھوں لوگوں نے اسلام قبول کیا ہوگا،ان میں ہر طبقہ کے لوگ ہیں، پروفیسر، عالم، فاضل لوگ کچھ سفیر بھی، اور اگر آپ یقین کریں تو پیرس میں بعض پادری اور نن بھی مسلمان ہوئے ہیں۔الحمدللہ ان میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہمارے مسلمان ہونے کا اعلان نہ کیا جائے اور اگر ہمیں نام دینے کی ضرورت ہو تو بلا اجازت ہمارا نام نہ دیں۔''

ہندوستانی دستور سازی کے لیے مدعو: 1950ء میں حکومت پاکستان نے پہلی دستور ساز اسمبلی کو ملکی قوانین کی تدوین کے سلسلے میں اسلامی دستور سازی میں مدد دینے کے لیے ماہرین وعلماء کا ایک بورڈ تشکیل دیا تھا جس کے ارکان مولانا سید سلمان ندوی، مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر انصاری، مفتی جعفر حسین مجتہد اور ڈاکٹر حمید اللہ دساتیر اسلامی اور بین الاقوامی قانون کے مستند ماہر سمجھے جاتے تھے۔ یہاں فائلیں بنتی گئیں اور داخل دفتر ہوتی رہیں۔ افسران بالا غیر اسلامی نظام حکومت کے لیے کوشاں تھے۔ڈاکٹر حمید اللہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا کہ جس کام کے لیے انہیں پیرس سے یہاں طلب کیا گیا تھا اس کے لیے کچھ نہیں ہورہا ہے۔ 1951ء میں وہ پاکستان سے واپس پیرس روانہ ہوگئے۔

ڈاکٹر احتشام الدین خرم اپنی کتاب ''ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیات اور ادبی خدمات'' میں لکھتے ہیں 1985ء میں پاکستان کے صدر ضیا الحق مرحوم نے ڈاکٹر حمید اللہ کو ''ہلال پاکستان'' کا اعلیٰ اعزاز عطا کیا اور تحقیقات اسلامی بین الاقوامی ہجرہ ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا لیکن انہوں نے یہ رقم فوراً تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کو بطور عطیہ دے دی۔ ادارے نے اس رقم سے ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری قائم کی۔

1994ء میں عالمی شاہ فیصل ایوارڈ کے لیے ڈاکٹر حمید اللہ کا انتخاب ہوا تو آپ نے ازراہِ بے نیازی ایوارڈ لینے سے انکار کردیا کیونکہ اپنی خدمات کا صلہ آپ عنداللہ لینے کے قائل ہیں۔محمد طفیل مدیر نقوش نے ڈاکٹر صاحب کو دس ہزار کا انعام سیرتِ ابن اسحاق پر دینے کا اعلان کیا تو ڈاکٹر صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں۔

www.urduacademyts.com

''مجھے آپ نے ایک انعام دینا طے کیا ہے اس میں میری قدر افزائی ہے جس پر شکر گزار ہوں لیکن دنیا میں انعام لوں تو آخرت میں محرومی کا ڈر ہے کیا یہ ممکن ہے کہ آپ یہ رقم میری طرف سے کسی موزوں ادارے کو دے دیں۔''

وفات: سید عطا اللہ ڈاکٹر حمید اللہ کے بڑے بھائی صبغۃ اللہ مرحوم کی پوتی اور جناب احمد عطا اللہ کی صاحبزادی فرماتی ہیں۔''17 / دسمبر 2002ء کو وہ اس دنیا سے چلے گئے اس وقت ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اُن کے پیر اسی طرح جڑے ہوئے تھے اوران کے ہاتھ اسی طرح بند تھے جیسے وہ نماز کی ادائیگی کے وقت کیا کرتے تھے''۔آپ کی تدفین امریکہ میں Chapel Hill کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

ڈاکٹر احتشام الدین خرم "ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیات اور ادبی خدمات" میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر حمید اللہ کی خواہش تھی کہ وہ اُن خوش قسمت انسانوں میں سے ہوں جن کی زندگی خواہ گمنامی ہی میں گزری ہو، جن کی وفات بھی گمنامی ہی میں ہوئی ہولیکن ان کی خدمات کا اعتراف ان کے انتقال کے دوسوسال بعد بھی کیا جائے۔اُنہوں نے ایسی ہی زندگی گزاری اور یقیناً وہ ایسے ہی انسانوں میں تھے''۔

مفتی عظیم الدین صاحب نے ڈاکٹر حمید اللہ کی تاریخ وفات قرآنِ مجید کی مشہور آیت سے اس طرح نکالی ہے:''قال ارحم الراحمین الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون'' اس سے 2002ء کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے 1948ء میں جو فلیٹ پیرس میں کرایہ پر لیا تھا اس عمارت کی چوتھی منزل پر تھا۔ وہاں تک پہنچتے ہوئے 120 سیڑھیاں چڑھنی ہوتی تھیں۔جس میں لفٹ نہ تھی۔انہوں نے پیرس میں قیام آخری ایام تک اسی میں سکونت رکھی۔اس فلیٹ کا ایک ایک کونہ بشمول باورچی خانہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا، اور یہی ان کی سب سے بڑی دولت تھی۔زندگی اتنی سادہ کہ کپڑوں کے چند جوڑوں اور کھانے کے چند برتنوں کے سوا ان کے گھر میں کچھ نہ تھا۔غرض کہ کوئی خادم اور نہ کوئی رشتہ دار۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ اُردو، فارسی، عربی، ترکی کے علاوہ جرمن، فرنچ، انگلش، لاٹن اور رشین پر عبور رکھتے تھے، اُن سب زبانوں کے علاوہ انڈونیشین، ملائشین اور پرتگیزی زبانوں میں بھی ان کی تصانیف موجود ہیں۔ اشاعت اسلام کے سلسلے میں انہیں اس لسانی مہارت سے بڑی مدد ملی۔انہوں نے اہل مغرب کو اسلام کی حقیقی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی سیرت طیبہ سے متعارف کرانے کے لیے مختلف زبانوں میں ہزار سے زیادہ مقالے اور 175 سے زیادہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان کی کتابوں اور مقالوں کا ترجمہ روسی، چینی اور جاپانی

www.urduacademyts.com

کے علاوہ دُنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا ایک علمی کارنامہ نہیں کئی تحقیقی کارنامے اور علمی شاہکار ہیں۔ ان کا سب سے عظیم کارنامہ فرانسیسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ یہ اتنا مقبول ہوا کہ اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہر ایڈیشن لاکھوں کی تعداد میں طبع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ تاریخ اور آثار اسلامیہ کے بڑے ماہر تھے۔ ''عہد نبوی کے میدان جنگ'' آپ کی وہ بے مثال و بے نظیر کتاب ہے جو عرب کے ریگستانوں میں بذات خود پیدل گھوم گھوم کر تلاش و تحقیق کے بعد ترتیب دی گئی۔ یہ کتاب سیرت نبوی کے ایک اچھوتے اور اہم موضوع پر ماہرانہ کارنامہ ہے۔ اسلام کے دور اول کی تاریخ پر نئے فنون کی روشنی میں بحث و تبصرہ حمید اللہ صاحب کا خاص موضوع ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے فنی نقطۂ نظر سے جنگ بدر، احد، خندق، فتح مکہ اور حنین و طائف غزوات کے واقعات کو پیش کیا اور تصاویر اور جنگی میدانوں کے تفصیلی نقشے دیے ہیں۔ کتاب کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان لڑائیوں کے محل و وقوع کا بہ چشم خود معائنہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہند نے تحریر فرمایا ہے:

''اس تحقیق نے تاریخ اسلام کے مطالعہ کرنے والوں پر بڑا احسان کیا ہے اور ایک نئی راہ کھولی ہے۔''

یہ کتاب انگریزی، فرانسیسی، ترکی میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اُردو میں اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

خطبات بہاول پور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور (پاکستان) کی دعوت پر ڈاکٹر حمید اللہ نے 9/ مارچ تا 20/ مارچ 1980ء میں مکمل 12 دن نہایت ہی شگفتہ انداز میں متعدد اسلامی موضوعات پر لیکچر دیے۔ ان خطبات کو ٹیپ کر لیا گیا تھا۔ پھر ان کو تحریر میں لا کر کم و بیش من و عن ''خطبات بہاول پور'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کی جانب سے شائع ہوا۔ اس تیسرے ایڈیشن کی تصحیح خود ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کی۔ 1997ء میں اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی نے اسے نستعلیق پر شائع کیا۔ خطبات بہاول پور کا ایک انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ خطبات مختلف اسلامی موضوعات پر ہیں۔ برسوں کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ یہ بے نظیر معلومات آفرین خطبات کی تحریری یادداشت کے بغیر برجستہ دیے گئے۔ بلحاظ موضوع و مواد اور بہ اعتبار افادۂ عام ان کے خطبات کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی زندگی کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

www.urduacademyts.com

''ہزار کیے ہوئے کاموں کا افسوس اور ہزار نہ کیے ہوئے کاموں کی حسرت' یہ ہے میری سوانح عمری کا خلاصہ''۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے علمی کارنوں کا ایک اہم حصہ اُن خطوط پر مشتمل ہے جوانہوں نے دوست احباب کو لکھے تھے۔ یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ ایک فرد واحد نے اپنی بے پناہ مشغولیات کے باوجود اپنی حیات میں پندرہ ہزار سے زائد خطوط لکھے تھے۔

1947ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد اپنے وطن عزیز ریاست حیدرآباد کا مقدمہ لے کر اقوام متحدہ گئے تھے۔ لیکن جب 1948ء میں سقوط حیدرآباد کا سانحہ ہوا تو ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی حمیت نے گوارہ نہ کیا کہ ایک آزاد ملک سے نکل کر ایک غلام ملک میں دوبارہ داخل ہوں۔ اس لیے علم کے اُس پیاسے نے سکون کی تلاش میں پیرس فرانس کو اپنا عارضی وطن بنایا۔ اور دیار غیر میں رہ کر زائد از پچاس سال تک دین اسلام کی خاموش خدمت کی اور اپنے علم اور کارناموں کی ضیاء پاش کرنوں سے عالم اسلام اور دنیاوی فکر کو روشنی دی۔

☆☆☆

ڈاکٹر موسیٰ اقبال
اسوسیٹ پروفیسر شعبہ اُردو
تلنگانہ یونیورسٹی۔ نظام آباد

مضامین

حقیقی قربانی

۔۔۔ڈاکٹر تیزی سے ہسپتال میں داخل ہوا' کپڑے تبدیل کئے اور سیدھا آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھا' ایک بچے کے آپریشن کے لئے فوری اور ہنگامی طور پر اسے بلایا گیا تھا۔ ہسپتال میں موجود بچے کا باپ ڈاکٹر کو آتا دیکھ کر چلّایا ''اتنی دیر لگادی! تمہیں پتا نہیں میرا بیٹا کتنی اذیت میں ہے۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے' تم لوگوں کو کوئی احساس ذمہ داری ہی نہیں''۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر جواب دیا کہ مجھے افسوس ہے میں ہسپتال میں نہیں تھا' جیسے ہی مجھے کال ملی میں جتنی جلدی آسکتا تھا' آیا ہوں' اب میں چاہوں گا کہ آپ سکون سے بیٹھئے تاکہ میں اپنا کام شروع کرسکوں''۔ باپ غصے سے بولا ''میں سکون سے بیٹھوں' اگر اس حالت میں تمہارا بیٹا ہوتا تو کیا تم سکون سے بیٹھتے؟''۔ ڈاکٹر نے پھر مسکرا کر کہا ''اللہ قادر مطلق ہے' حی وقیوم اور غفور ورحیم ہے' ڈاکٹر کسی کو زندگی نہیں دیتا' نہ کسی کی عمر بڑھا سکتا ہے۔ آپ آرام سے بیٹھیں اور بیٹے کے لئے دعا کریں' ہم آپ کے بیٹے کو بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ آپریشن میں کئی گھنٹے لگ گئے' بالآخر جب ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر آیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا ''آپ کا بیٹا اب خطرے سے باہر ہے' اگر کچھ پوچھنا ہے تو نرس سے معلوم کرلیں۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

''کتنا مغرور شخص ہے یہ ڈاکٹر' کچھ لمحوں کو بھی نہیں رکا کہ میں بچے کی حالت کے بارے میں پوچھ لیتا۔ بچے کے باپ نے نرس سے کہا۔

نرس نے روتے ہوئے جواب دیا ''ڈاکٹر کا بیٹا کل ایک حادثے کا شکار ہوگیا تھا جب ہم نے اسے آپ کے بیٹے کے لئے کال کی تو وہ اس کے آخری سفر کے انتظامات میں مصروف تھا۔ مگر کال سنتے ہی وہ آپ کے بچے کو بچانے آگیا۔ اور آپ کے بیٹے کی جان بچانے کا فرض ادا کر کے اپنے بیٹے کی تدفین کے لئے چلا گیا ہے''۔

اس واقعہ کی روشنی میں ہمیں کسی پر بدگمانی نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی بے جا تنقید کرنی چاہیے' اس لئے ہمیں پتہ نہیں کہ کوئی ہمارے لئے ہمارے کام آنے کے لئے کتنی بڑی قربانی دے رہا ہے۔ (ماخوذ)

www.urduacademyts.com

جاں نثار اختر کی شاعری

اُردو ادب میں جاں نثار اختر کا نام بڑے ہی احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کو گھر آنگن کی شاعری کہتے ہیں۔ جاں نثار اختر فبروری 1914 کو گوالیار میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن خیرآباد ضلع سیتا پور اودھ ہے۔ ان کا خاندانی نام جاں نثار حسین اختر ہے۔ جاں نثار اختر کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے والد مضطر خیرآبادی خمریات کے مشہور اور غزل کے نامور شاعر تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گوالیار میں حاصل کی اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی، علی گڑھ کی علمی و ادبی فضاء نے ان کی شاعری کو نئے زاویے عطا کئے۔ 13 برس کی عمر میں اپنی پہلی غزل کہی تھی، جس وقت وہ طالب علم تھے۔ وہ زمانہ شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ جگرؔ، حسرتؔ، مجروحؔ، ساحرؔ، کیفیؔ، اصغر، ساغر، جوشؔ جیسے شعراء موجود تھے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی وہ بطور شاعر مشہور ہوگئے۔ اس لئے کہ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے ایک نظم ''گرلس کالج کی لاری'' لکھی تھی۔ جس کی شہرت سے وہ خود بھی مشہور ہوگئے۔ یہ نظم انہوں نے 1936 میں لکھی تھی۔ علی گڑھ میں کوئی بھی محفل ہوتی تو ''گرلس کالج کی لاری'' نظم پڑھنے کو اصرار کیا جاتا تھا، اس نظم کے اشعار ہر ایک کی زبان پر تھے۔ جس کا پہلا شعر:

فضاؤں میں ہے صبح کا رنگ طاری
گئی ہے ابھی گرلس کالج کی لاری

اور اس نظم کا آخری شعر:

فسانہ بھی اُن کا ترانہ بھی اُن کا
جوانی بھی اُن کی زمانہ بھی اُن کا

جاں نثار کی شاعری کا ایک دور وہ تھا جب علی گڑھ کی علمی اور رومانی فضاء نے اُنہیں گرلز کالج کی لاری جیسی نظمیں لکھنے پر مجبور کیا۔ اس کے علاوہ ''کون سا گیت سنوگی''، انجم، مسافر اور ساقی جیسی نظموں سے جمالیاتی اور رومانی فضاء جھلکتی ہے۔ جاں نثار اختر کی شاعری کے تعلق سے خواجہ احمد فاروقی نے ایک جگہ لکھا:۔

''جاں نثار اختر نے بدن کی خوشبو، بہتی ہوئی ندیاں اور سوتی ہوئی کرن کو محسوس اور جاندار استعاروں کے قالب میں ڈھال دیا ہے اور اسی لئے ان کے شعر پیکر تصویر بن گئے ہیں، ان میں الفاظ کا رقص ہے، حیات کا نغمہ ہے''

جاں نثار اختر کے شعری مجموعہ'' سلاسل'' کے بارے میں جوشؔ ملیح آبادی نے لکھا ہے:

''اختر کی شاعری میں ہمیں زندگی کی حقیقتیں، مناظر کی دلفریبیاں، نفسیات کی باریکیاں اور رومان کی برنائیاں ملتی ہیں، اور یہ سب چیزیں ایسی سموئی ہوئی ہیں، جس طرح کوئی نباضِ موسیقی متعدد راگنیوں کو ملاکر ایک ایسا

www.urduacademyts.com

نغمۂ شیریں پیدا کرتا ہے کہ بزم پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔اس کے دوش بدوش اخترؔ کی شاعری میں جو انقلابی عنصر ہے وہ اس قدر جاندار اور جاندار کے ساتھ ساتھ اس قدر دل کش وہموار ہے کہ دلوں پر براہ راست اثر کرتا ہے،خوابیدہ امنگوں کو جگاتا اور کشود کار کے ولولوں کو برانگیختہ کردیتا ہے۔''

آل احمد سرور نے جاں نثار اختر کی شاعری پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

''جاں نثار اختر کے یہاں روایت کے صالح عناصر کی پاسداری اور عرفان کے ساتھ اس دور کے درد داغ اور سوز وگداز کی جس طرح آئینہ داری کی گئی ہے وہ بڑے بڑوں کے بس کی بات نہیں۔جاں نثار نے نئے پن کو سمجھا بھی ہے اور برتا بھی ہے۔ (پچھلے پہر،جاں نثار اختر ص 3)

شاعر کا اظہار شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔اس لئے کہ ان کی شاعری میں نظمیں ہوں کہ غزلیں دونوں میں ان کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔

جاں نثار اختر نے اپنی شاعری کا لوہا خود منوالیا ہے ، چنانچہ کہتے ہیں:

ہماری قدر کرو اے سخن کے متوالو
غزل کو کل نہ ملیں گے مزاح داں ہم سے

وہ ایک رومانی شاعر تھے۔انہوں نے اپنے اشعار میں تصور محبوب کو زندگی قرار دیا ہے۔وہ اپنی بیوی کو محبوبہ کے روپ میں دیکھتے رہے۔صفیہ اختر اور جان نثار اختر دونوں کو ایک دوسرے سے بے پناہ محبت تھی،جس کا اظہار جاں نثار اختر نے اپنی شاعری میں کیا ہے اور صفیہ اختر نے اپنے خطوط میں اپنے محبوب سے بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے،لہٰذا دونوں کی جوڑی مثالی جوڑی رہی ہے،اس لیے جاں نثار اختر اپنی محبوبہ کے تصور کو لئے ہوئے کہتے ہیں:

تیری پیشانی رنگیں میں جھلکتی ہے جو آگ
تیرے رخساروں کے پھولوں میں دمکتی ہے جو آگ
تیرے سینے میں جوانی کی دہکتی ہے جو آگ
زندگی کی یہ حسیں آگ مجھے بھی دے دے

اس کے علاوہ:

آج بھی جیسے شانوں پر تم ہاتھ میرے رکھ دیتی ہو
چلتے چلتے رک جاتا ہوں ساڑی کی دوکانوں پر

اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کس قدر زندگی کو اپنی محبوبہ کی یادوں سے بسائے ہوئے رکھے ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوکر اشتراکی نظریات کے مبلغ بنے تو پانچ تصویریں ، دانائے راز اور مزدور عورتیں جیسی نظمیں وجود میں آئیں۔انہوں نے پہلے تو شاعری کو غزل میں یوں پیش کیا:

فتنۂ عقل کے جویا میری دنیا سے گذر
مری دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

ooo

اشعار میرے یوں تو زمانے کے لئے ہیں
کچھ شعر فقط ان کے سنانے کے لئے ہیں

ooo

www.urduacademyts.com

یہ علم کا سودا، یہ رسالے، یہ کتابیں
اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لئے ہیں

جاں نثار اختر مشرقی اقدار کے امین رہے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، ان کی غزلوں میں نئی تہذیب اور پرانی تہذیب کا سنگم دکھائی دیتا ہے:

کوئی بھی شئے ہو مجھے تو حسیں لگتی ہے
اسی نگاہ نے شاعر بنادیا ہے مجھے

انہوں نے غزل کی تعریف ایک شعر میں اس طرح کی ہے:

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپادی جائے

اختر کی غزلوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ لہجہ کی گھلاوٹ، عصر حاضر کی آواز، زندگی کا سوز وگداز اور درد کی کسک ان کی غزلوں میں شامل ہے:

کوئی آسودہ نہیں اہل سیاست کے سوا
یہ صدی دشمن ارباب ہنر لگتی ہے

ooo

دل کو چھوجاتی ہے یوں رات کی آواز کبھی
چونک اُٹھتا ہوں کہیں تو نے پکارا ہی نہیں

ooo

آئے کیا کیا یاد نظر جب پڑی ان دالانوں پر
اس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشندانوں پر

17 رجنوری 1953ء کو ان کی شریک حیات صفیہ اختر کا انتقال ہوگیا اور بروقت آخری دیدار کے لیے لکھنؤ پہونچے تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا، اسی سے متاثر ہوکر ''خاک دل''، نظم کہی، جس میں اسی بے بسی کی عکاسی کی ہے:

لکھنؤ، میرے وطن، میرے چمن زار وطن
دیکھ اس خاک کو آنکھوں میں بسا کر رکھنا
اس امانت کو کلیجے سے لگا کر رکھنا

ooo

زندگی دیکھ مجھے عزمِ سفر دیتی ہے
ایک دل شعلہ بجاں ساتھ لیے جاتا ہوں
ہر قدم تولنے کبھی عزم جواں بخشا تھا
میں وہی عزم جواں ساتھ لیے جاتا ہوں

اس کے علاوہ ''لوح مزار پر'' پر ایک نظم ہے، جس میں وہ ذہنی انتشار اور فکری محبت کا اظہار کرتے ہیں:

ڈھل چکا دن اور تیری قبر پر
دیر سے بیٹھا ہوا ہوں سرنگوں

اور پھر کہتے ہیں:

جیسے تیرے ساتھ ساتھ میں بھی دفن ہوں

ooo

اختر کو اپنی شریک حیات کی موت کا غم اس قدر تھا کہ اس سے وہ برسوں سنبھل نہ سکے۔ انہوں نے اپنی غزل میں کلاسیکی شاعری کی پاسداری کا خیال بھی رکھا ہے اور ذہنی کشمکش کو بھی پیش کیا۔ اپنی محبوبہ کے ساتھ گذرے ہوئے لمحوں کو یوں پیش کیا ہے:

گذر گیا ہے کوئی لمحہ شرر کی طرح
ابھی تو میں اسے پہچان بھی نہ پایا تھا

مضامین

www.urduacademyts.com

کیسے کیسے ترا دیدار کیا ہے میں نے
زندگی تجھ سے بہت پیار کیا ہے میں نے

جاں نثار اختر عاشقانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں میں زیادہ تر اشعار عاشقانہ رنگ لئے ہوئے ہے:

کون کہتا ہے تجھے میں نے بھلا رکھا ہے
تیری یادوں کو کلیجے سے لگا رکھا ہے

ooo

دیکھ جا آ کے مہکتے ہوئے گلشن کی بہار
میں نے اب تک ترے گلشن کو سجا رکھا ہے
لمحے لمحے میں بھی ہے تری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

ooo

سو چاند بھی چمکیں گے تو کیا بات بنے گی
تم جو آئے تو اس رات کی اوقات بنے گی

جاں نثار اختر کا تعلق لکھنو سے بھی رہا ہے، اس لئے لکھنو سے انہیں انسیت تھی۔ اس طرح شاعری میں لکھنو سے محبت کا عکس چھلکتا ہے۔ آزادی کے بعد جب اردو زوال پذیر ہونے لگی، تو اردو کے دبستاں لکھنو اور دہلی اجڑ گئے تو جاں نثار بھی اس درد سے تڑپ اٹھے:

لکھنو کیا تیرے گلیوں کا مقدر تھا یہی
ہر گلی آج تری خاک بسر لگتی ہے

ooo

نئی تہذیب کیسے لکھنو کو راس آئے گی
اجڑ جائے گا یہ شہر غزالاں ہم نہ کہتے تھے

ooo

دلی کہاں گئیں ترے کوچوں کی رونقیں
گلیوں سے سر جھکا کے گذرنے لگا ہوں میں

ان کے اشعار میں لکھنؤ اور دلّی سے محبت کا عکس اور زمانہ کا درد بھی ہے۔ وہ تقسیم ہند کے المیہ پر کچھ کہے بغیر نہ رہ سکے:

زمین ہوگئی کس قاتل کا داماں ہم نہ کہتے تھے
اکارت جائے گی خون شہیداں ہم نہ کہتے تھے

ooo

کس کی دہلیز پر لے جا کے سجائیں اس کو
بیچ راستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

ooo

جاں نثار اختر ایک جذباتی انسان تھے، ان کے جذبات گھر کے اندر محدود نہیں تھے، بلکہ دنیا کے حالات سے وہ بھی متاثر ہوئے، بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے تعلق سے انہوں نے نظم کہی ہے، جس کا نام ''فتح بنگال'' ہے۔ چنانچہ:

ارض بنگلہ تجھے مٹتے ہوئے دیکھا نہ گیا
اپنی رگ رگ میں حمیت کا لہو جاگ اُٹھا

ooo

فرض کی آنچ سے غیرت کا لہو جاگ اُٹھا
کل چھڑا تھا جو فسانہ تری آزادی کا

ooo

www.urduacademyts.com

خون ریز فسادات کے بعد آزادی کا حاصل ہونا، ایسے میں ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے معاشرے سے جڑے رہنا حالات کا نتیجہ تھا۔ تہذیبی ورثے کی تباہی ، اقدار کی شکست اس اس کا نتیجہ تھا، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے پیچھے

اُن کے اشعار میں درد کی کسک بھی ہے:

اب یہ بھی ہے ٹھیک کہ ہر درد مٹادیں
کچھ درد کلیجے سے لگانے کے لئے ہیں

ان کی شاعری میں ماضی کے حالات کا کرب بھی ملتا ہے۔ جیسا کہ گذرے ہوئے لمحات، ''پچھلی پریت''، تصور یہ سب نظمیں اس کی مثال ہیں۔ انہوں نے اپنے بعض اشعار میں دیہاتی ماحول کو دلکش انداز میں پیش کیا۔ ان اشعار میں کہیں کہیں ہندی لفظیات کو بھی استعمال کیا گیا ہے:

برکھا کی تو بات ہی چھوڑو چنچل ہے پروائی بھی
جانے کس کا سبز دوپٹا پھینک گئی ہے دھانوں پر

برکھا، چنچل، پروائی وغیرہ ہندی الفاظ انہوں نے نہات خوبصورتی سے استعمال کئے ہیں۔ جاں نثار اختر کے اب تک متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جاوداں، گھر آنگن، خاک دل، پچھلے پہر وغیرہ۔

اس عظیم شاعر کا انتقال 19/ اگست 1976ء کو ہوا۔

☆☆☆

ڈاکٹر حمیرہ تسلیم

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ساتاواہنا یونیورسٹی، کریم نگر

حکایت

ایک ایماندار اور غریب بڑھئی کا بسولا ندی میں گر پڑا۔ بڑھئی نے دعا کی کہ ''اے اللہ میں غریب آدمی ہوں اور میرے رزق کی ڈوئی ندی میں گر پڑی ہے۔ تم میری مدد کر، میرا بسولا مل جائے''۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا منظور کی اور خود بخود ندی سے ایک سونے کا بسولا نکل کر اس کے سامنے آ گیا اور آواز آئی کہ ''لے اپنا بسولا''۔ بڑھئی نے کہا ''اے اللہ! یہ میرا بسولا نہیں ہے''۔ پھر چاندی کا بسولا نکلا اور آواز آئی کہ ''لے اپنا بسولا''۔ بڑھئی نے کہا ''نہیں میرے پیارے اللہ'' ''یہ بھی میرا نہیں ہے''۔ پھر لکڑی کا بسولا نکلا جسے بڑھئی نے پہچان لیا اور کہا ''ہاں میرے اللہ یہی میرا بسولا ہے''۔ اور ہاتھ بڑھا کر اسے لے لیا۔ اللہ تعالیٰ کو بڑھئی کی یہ بات بہت پسند آئی، پھر غیب سے آواز آئی کہ ''لے یہ سونے اور چاندی کے بسولے بھی تیری ایمان داری کے صلے میں تجھے انعام میں دیے جا رہے ہیں، انہیں لے اور اپنا کام کر''۔ یہ سب ایک بدذات اور بے ایمان آدمی بھی دیکھ رہا تھا۔ اگلے دن اس قصداً ایک بسولا ندی میں ڈالا اور لگا چلّانے ''اے اللہ میرا بسولا، میرا بسولا''۔ ندی سے سونے کا بسولا نکلا اور آواز آئی کہ ''لے اپنا بسولا''۔ آواز کے سنتے ہی یہ بے ایمان کہتا ہوا دوڑا کہ ''ہاں یہ میرا ہی بسولا ہے''۔ جواب میں آواز آئی کہ ''تو پاجی ہے بسولا تیرے پاس نہیں آ سکتا، تو بسولے کے پاس چلا آ''۔ اس بے ایمان نے جیسے ہی بسولے کے پاس جانے اپنا پاؤں آگے بڑھایا، اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ندی میں ڈوب کر مر گیا۔ اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بے ایمان آدمی لالچ میں ظاہراً اللہ کو پکارتا ہے مگر دل سے اس کا ادب نہیں کرتا۔

ماخوذ از ''منتخب الحکایات''

مصنفہ خان بہادر شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ ڈپٹی محمد نذیر احمد

www.urduacademyts.com

مضامین

حکیم سید شمس اللہ قادری کی علمی و تحقیقی خدمات

چمنستان اردو ادب کو بہت سے اہل قلم و اہل سخن نے اپنے خون جگر سے سینچا اور اپنے فکر و خیال کے گلہائے رنگارنگ کی عطر بیزی سے اہل چمن کے مشامِ جان کو معطر کیا اور اردو ادب کی زرخیز وادیوں میں مختلف انواع و اصناف کے اشجار و نونہالوں کی ایسی آبیاری کی کہ گلشن اردو کا دامن مختلف گلوں کے تختوں سے لہلہانے لگا۔ ایسے یکتائے روزگار، نابغہ وقت اور جامع العلوم اہل اصحاب کمال میں شمس المورخین حکیم شمس اللہ قادری بھی ایک تھے۔

حکیم شمس اللہ قادری عظیم المقام محقق، تاریخ و آثار قدیمہ کے جید عالم، قدیم مسکوکات کے بے مثل ماہر اور اعلیٰ پایہ کے مورخ و مولف تھے۔ ان کی ولادت ۵/نومبر ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء کو بمقام لال باغ حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کے والد سید ذوالفقار اللہ تھے جنھوں نے سات حج کیے تھے۔ وہ مزاجاً درویش اور تصوف پیشہ بزرگ تھے۔ جن کا سلسلۂ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی سے جاملتا تھا۔ ان کے اسلاف کا ملجا و ماویٰ بغداد تھا۔ مغل تاجدار اکبر کے عہد میں ان کے خاندان کے ایک بزرگ ہندوستان آئے اور دہلی میں کچھ عرصے بود و باش اختیار کی۔ حکیم صاحب کے جد امجد سید شاہ عبداللطیف قادری شہنشاہ ورنگ زیب عالمگیر کے میر تسبیح خانہ تھے۔ ان کی اولاد نے آصف جاہ اول کے ساتھ اورنگ آباد کا رخ کیا اور ایک مختصر مدت کے قیام کے بعد حیدرآباد چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ حکیم صاحب کے دادا سید بقاء اللہ قادری مہاراجہ چندولال شاداں کے عہد وزارت میں میر منشی تھے۔ حکیم صاحب کی والدہ ماجدہ کا تعلق بیجاپور کے صوفی سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ کے خانوادے سے تھا۔

حکیم صاحب اپنے والد (سید ذوالفقار اللہ قادری) کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کا لڑکپن اپنے والد کے ہمراہ سیروافی الارض کے مشغلے میں گزرا۔ انھیں کسی مدرسے میں باقاعدہ حصول تعلیم کا موقعہ نہیں ملا ابتدا میں اپنے والد سے، پھر ان کے رفقا سے بے ضابطہ خانگی طور پر تعلیم حاصل کی، ان کے اساتذہ میں سرسید احمد خاں، فارسی کے مشہور شاعر اور علامہ اقبالؔ کے استاد غلام قادر گرامی، مولانا نذیر حسین محدث دہلوی اور ماسٹر رام چندر قابل ذکر ہیں و نیز مولانا عبدالوہاب انصاری المعروف 'حکیم نابینا' سے علم طب کی تحصیل کی اور ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے کے فیض صحبت میں علم تحقیقات و تدقیقات کا درس حاصل کیا۔ حکیم صاحب نے کبھی پیشۂ ملازمت اختیار نہیں کیا، اگرچہ ان کی زندگی میں معقول ملازمتوں کے متعدد مواقع فراہم ہوئے لیکن انھوں نے علمی مصروفیات اور ادبی خدمت کو ملازمت پر ترجیح دی۔ ان کی دلچسپی تاریخ، آثار قدیمہ، مسکوکات، شجرات، فارسی و دکنی ادب اور انسائیکلوپیڈیا و لغات سے تھی اور زندگی بھر ترقیم اور تصنیف و تالیف میں لگے رہے۔ ان کی کم و بیش دو درجن تحقیقی کتابیں آثار قدیمہ، مسکوکات، تاریخ اسلام، فارسی ادب، مشاہیر اور

www.urduacademyts.com

اردو کے قدیم ادب پر شائع ہو چکی ہیں۔

حکیم صاحب کے مزاج میں شہرت و خودنمائی کا جذبہ نہیں تھا وہ خاموش اور ٹھوس خدمت کے قائل تھے۔ انھوں نے اپنے علم اور قابلیت کو جلب منفعت کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ ان کی درخواست پر آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں والئی دکن نے ایک فرمان مورخہ ۲۱ر شوال ۱۳۴۸ھ/۲۳ مارچ ۱۹۳۰ء کو صادر کیا جس کے ذریعہ حکیم صاحب کو مبلغ پانچ ہزار روپئے یک مشت اور بطور صلّہ تصانیف ڈیڑھ سو روپئے ماہوار علمی وظیفہ تاحین حیات جاری کر کے حکیم صاحب کے قابل قدر علمی و تحقیقی کارناموں کا اعتراف کیا۔ نیز قرار پایا کہ حکیم شمس اللہ قادری کی تصانیف کی آئندہ اشاعتوں کے موقع پر مصارف طبع اور اشاعت کے متعلق گورنمنٹ ہمدردانہ سلوک کرے گی۔ یہ بھی طئے پایا کہ حکیم صاحب کے علمی کاموں کی جامعہ عثمانیہ کی جانب سے نگرانی کی جائے گی۔ حکیم صاحب زود نویس تھے لیکن کبھی انھوں نے معیار سے سمجھوتا نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے طویل مضامین کتابی صورت میں طبع کیے۔ آخر کار ۲۲ر اکٹوبر ۱۹۵۳ء کو ۶۸ سال کی عمر میں تاریخ و تحقیق کا آفتاب موت کی وادی میں غروب ہو گیا۔ جذب عالمپوری نے تاریخ وصال 'شمس بلدہ غروب شد برخواں' سے مادۂ تاریخ ۱۹۵۳ء برآمد کیا۔

حکیم سید شمس اللہ قادری بحیثیت مورخ: حکیم صاحب نے تاریخ، تحقیق، تدوین اور تذکرہ نگاری غرض ہر شعبے میں یادگار تصانیف چھوڑی ہیں جس سے ان کی معلومات اور ان کی تحقیقی بصیرت و شعور کا عکس نمایاں ہوتا ہے لیکن تاریخ ان کا محبوب ترین موضوع تھا۔ اس موضوع پر ان کی نمائندہ تصانیف ان کی تاریخ دانی کی شاہد ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ آثار الکرام: حکیم صاحب ہندوستان کے عظیم الشان ماضی کی بالخصوص دکن کے مسلمان فرماں رواؤں کے عہد کے علمی، تاریخی، تہذیبی و ثقافتی اور تمدنی کارناموں کی مکمل تاریخ لکھنا چاہتے تھے۔ آثار الکرام اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی جس میں انھوں نے سبکتگین اور اس کے جانشینوں کے دور حکومت کے علمی کارناموں پر مفصل بحث کی اور ان حکمرانوں کے علمی مذاق، رفاہِ عام اور اصلاحی کاموں کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

۲۔ مورخین ہند: اس تصنیف میں مورخین ہندوستان کی معتبر و مستند کتب تواریخ کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے ان کے مصنفین کے تذکرے یعنی ان کی فروگزاشتوں و تسامحات کی نشاندہی اور تصحیح کی ہے اور ان کی تحقیق کی لغزشوں کی اصلاح بھی کی ہے۔ ان میں چند تصانیف کے نام یہ ہیں:

طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، طبقات ناصری، تزک بابری، ہمایوں نامہ، آئین اکبری، تزک جہانگیری، مراۃ احمدی، بساتین السلاطین، برہان المآثر وغیرہ۔ بقول حکیم شمس اللہ قادری ''یہ کتاب ایک قسم کی تاریخ التاریخ ہے۔'' (مورخین ہند۔ پیش لفظ) یہ کتاب مطبع نظام دکن میں طبع ہو کر دفتر رسالہ تاریخ سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ مورخین دکن: اس میں حکیم صاحب نے آصف جاہی دور کے بعض اہم کتب تاریخ کا تنقیدی جائزہ اور ان کے مورخوں و مصنفوں کا حال بیان کیا ہے۔

۴۔ تجارت العرب قبل الاسلام: حکیم صاحب نے قدیم

www.urduacademyts.com

زمانے کے عربوں کی تجارت کے بارے میں عربی، فارسی اور یونانی وغیرہ زبانوں کی مستند تاریخی کتابوں کے حوالوں سے نہایت جامع اور مفصل معلومات اکٹھا کی ہیں اور عربوں میں تجارت کے آثار پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ قدیم عہد کے عرب کے تجارتی تعلقات کن اقوام اور ممالک سے تھے اور ان کی اشیائے تجارت کیا تھیں۔ڈاکٹر ریحانہ کوثر لکھتی ہیں:

''قادری صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ اردو میں اس موضوع پر ان کی یہ تحریر سب سے پہلی تحریر ہے۔(مضمون مشمولہ اردوئے قدیم ،مولف حکیم سید شمس اللہ قادری، حیدرآباد،۲۰۱۵ء،ص:۲۴۵)

یہ کتاب ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں کتابی شکل میں طبع ہوئی۔اس سے قبل یہ ''دبدبہ آصفی'' حیدرآباد دکن میں شائع ہو چکی تھی اور پھر بار دوم ۱۹۲۳ء میں کارخانہ پیسہ اخبار لاہور کے خادم التعلیم برقی پریس میں با اہتمام میاں عبدالمجید پرنٹر و پبلشر طبع ہوئی۔

۵۔امرائے پائیگاہ: اس میں انھوں نے امرائے پائیگاہ نواب محمد ابوالخیر خاں بہادر امام جنگ، شمس الامرا نواب محمد ابوالفتح خاں بہادر شیخ جنگ کے سلسلۂ نسب اور ان کے مکمل کارناموں کی تاریخ لکھی ہے۔

۶۔امرائے آصفیہ: ایک مختصر رسالہ ہے جس میں نواب رکن الدولہ لشکر خاں نظام الملک آصف جاہ اول اور نواب رفعت الملک اول و دوم کا حال لکھا ہے۔

۷۔شجرۂ آصفیہ: ایک نادر اور کمیاب کتاب جس کو حکیم صاحب نے مرتب کر کے ایک مبسوط فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں لندن سے شائع کیا۔اس کے مصنف نواب معظم الدولہ معظم الملک محمد بدرالدین خان بہادر رفعت جنگ جو امیر کبیر شمس الامرا محمد فخرالدین خاں بہادر کے چوتھے فرزند تھے۔

۸۔سید محمد والہ موسوی: سید محمد والہؔ موسوی مشہور مثنوی ''طالب و موہنی'' کے خالق اور دربار آصفیہ کے ممتاز شاعر تھے۔ یہ نواب مہدی نواز جنگ (سابق گورنر مہاراشٹرا) کے جداعلیٰ تھے۔اس کتاب میں حکیم صاحب نے والہؔ کے حالات اور علمی و ادبی کارناموں کا احاطہ کیا ہے۔

تاریخی موضوعات پر اور بھی متعدد کتب ہیں جیسے ملیبار، پرتگیزان مالابار، محبوب الآثار وغیرہ۔

حکیم سید شمس اللہ قادری بحیثیت ماہر مسکوکات: تاریخ کے بعد حکیم سید شمس اللہ قادری کی غیر معمولی دلچسپی کا دوسرا میدان مسکوکات کی تحقیق و دریافت تھا۔انھیں جنوبی ہند کے اسلامی سکہ جات کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔انھوں نے اس فن میں بھی اپنی متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن کا تعارف درج ذیل ہے:

۱۔النقود الاسلامیہ: اس کتاب میں انھوں نے سلاطین مغلیہ شہنشاہ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب عالمگیر اور سلطان حسین صفوی کے عہد میں مروج سکّوں کے بارے میں گراں قدر معلومات رقم کی ہیں اور ہر سکّے کے دونوں رخوں پر کندہ عبارتوں سے بحث کی ہے۔ یہ کتاب تاج پریس حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔

سکّہ جات شاہان اودھ: اس کتاب میں شاہان اودھ اور ان کے سکوں کی تاریخ بیان کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس بادشاہ کے دور میں چاندی اور تانبے کے سکوں کی تعداد کیا تھی۔

www.urduacademyts.com

انھوں نے ان سکوں کے اقسام اور ان پر درج عبارت سے بھی بحث کی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۸ء میں حور پریس آگرہ سے چھپ کر شائع ہوئی۔

۳۔ مسکوکات قدیمہ: اس کتاب میں دکن میں سکہ جات کے رواج کی قدامت پر روشنی ڈالی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مسیحؑ سے سینکڑوں برس پہلے یہاں سونے، چاندی اور تانبے کے سکے رائج تھے جو گوٹیکہ کہلاتے تھے۔ مسکوکات شناسی کے موضوع پر حکیم صاحب نے کئی مضامین و مقالات بھی لکھے مثلاً سکہ جات، سلاطین بیجاپور، سکہ جات سلاطین گجرات، سکہ جات سلاطین مغلیہ اور سکہ جات ٹیپو سلطان وغیرہ۔

حکیم سید شمس اللہ قادری بحیثیت صحافی: حکیم سید شمس اللہ قادری کا تعلق صحافت سے بھی تھا۔ وہ ایک علمی رسالے کے مدیر بھی تھے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

رسالہ تاریخ: حکیم صاحب ایک سہ ماہی رسالہ ''تاریخ'' بھی نکالتے تھے جو رسالہ جنوری ۱۹۲۹ء سے کوٹلہ اکبر جاہ حیدرآباد دکن سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر حکیم سید شمس اللہ قادری تھے۔ چند سال بعد یہ نواب لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شائع ہونے لگا۔ یہ تاریخ اور آثار قدیمہ کے موضوع پر اردو کا واحد رسالہ تھا اور مقصد کے اعتبار سے اسم با مسمّٰی یعنی اس میں تاریخ اور آثار قدیمہ کے متعلق اعلیٰ پایہ اور محققانہ مقالات و مضامین شامل ہوتے تھے۔

اس رسالے میں حکیم صاحب کے علاوہ دیگر علمائے تاریخ کے مضامین درج ہوئے جو نہایت معیاری ہوتے تھے۔ حکیم صاحب نے تذکرہ اور تاریخ ادب پر بھی تحقیقی کام کیا ہے۔

حکیم سید شمس اللہ قادری بحیثیت ادبی محقق: حکیم سید شمس اللہ قادری دکنی ادب کے محققین کی صف اول سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ محقق اول ہی ہیں۔ ان کو دکنی زبان و ادب اور تحقیق سے خاص شغف تھا۔ اردو زبان کے عہد قدیم کو متعارف کروانے میں حکیم شمس اللہ قادری نے ہی پہل کی تھی۔ حکیم سید شمس اللہ قادری کی بلند پایہ تحقیقی تصنیف ''اردوئے قدیم'' شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے جو پہلی دفعہ ۱۹۲۵ء میں تاج پریس سے شائع ہوئی لیکن اس سے قبل اس موضوع پر حکیم صاحب کا ایک طویل مقالہ ''قدیم شعرائے اردو'' کے عنوان سے ۱۹۱۰ء میں 'لسان العصر' لکھنؤ کے چار شماروں میں ۱۹۱۰ء میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی وجہ تصنیف کے متعلق حکیم صاحب خامہ فرسا ہیں:

''آج سے کم و بیش بیس سال پہلے جب اردو اور ہندی کی بحث چھڑی تو اس کے ضمن میں اردو کی قدامت اور عمومیت بھی معرض بحث آ گئی۔ حامیان اردو نے ان مباحث پر جو مضامین شایع کیے ان میں دور قدیم بالکل مفقود نظر آیا۔ اس کمی کو محسوس کر کے ہم نے ۱۹۱۰ء میں ایک مضمون ''قدیم شعرائے اردو'' کے عنوان سے لکھا اور اس میں ان شعرا کے حالات اور ان کی زبان کے نمونے درج کیے جو دہلی میں ریختہ شاعری کے رواج پانے سے پہلے سرزمین دکن میں

www.urduacademyts.com

گزرے تھے۔''(اردوئے قدیم مولف حکیم سید شمس اللہ قادری، حیدرآباد ۲۰۱۵ء، ص:۲۰)

اس میں انھوں نے سلطنت بہمنی، سلطنت قطب شاہی، سلطنت عادل شاہی عہد کے بعض غیر معروف اردو شعرا وادبا کے حالات اور ادبی کارنامے تحقیق وتلاش کے بعد بیان کیے ہیں جو ناپید تھے۔جس سے تاریخ ادب اردو کا عہد قدیم گوشۂ گمنامی میں جانے سے بچ گیا۔ان کے اس مقالے سے دکنیات میں تحقیق کا ایک نیا باب وا ہوا اور اردو ادب کی تاریخ کو صدیوں آگے بڑھا دیا۔ بعد میں انھوں نے اس مضمون میں ترمیم و اضافہ کر کے کتابی شکل دی جو رسالہ 'تاج' حیدرآباد میں اسفندار ۱۳۳۱ف کے شمارے میں تاریخ زبان اردو''اردوئے قدیم'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔اس میں انھوں نے اردو زبان کے آغاز وارتقا سے بحث کرتے ہوئے سرزمین دکن میں بہمنی، قطب شاہی، عادل شاہی اور مغلیہ عہد کے شاعروں اور مصنفین کے حالات قلم بند کیے ہیں۔اسی معرکتہ الآرا تحقیقی کتاب اور اعلیٰ مورخانہ صلاحیتوں کی بنا پر علما و ارباب حل وعقد نے حکیم صاحب کو 'شمس المورخین' کے خطاب سے نوازا۔یہ کتاب مزید اضافوں کے ساتھ دوسری بار ۱۹۳۰ء میں طبع ہوئی۔زبان اردو اور اس کی نظم ونثر کی مفصل تاریخ خصوصاً دکنی ادب سے متعلق بعض قابل اعتماد معلومات پر مشتمل یہ اولین تحقیقی کتاب قرار دی جاتی ہے جس میں عہد بہ عہد کی ترقیوں کا تذکرہ اور ابتدائی زمانے سے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد آخر تک شعرا اور مصنفین کے بہت حد تک صحیح حالات مندرج ہیں۔انھوں نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی وغیرہ زبانوں کی مشہور ومستند کتابوں سے اخذ کر کے یہ کتاب تالیف کی۔دکنی شعرا کو تلاش وتحقیق کے بعد روشناس کرانے کا اولین سہرا حکیم سید شمس اللہ قادری کو جاتا ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین نے ''اردوئے قدیم'' کو اردو کی تواریخ میں حوالے کی بنیادی کتاب تسلیم کیا ہے۔(ڈاکٹر گیان چند جین، اردو کی ادبی تاریخیں، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۶۵) ''اردوئے قدیم'' کی تیسری اشاعت ۱۹۶۷ء میں مطبع نول کشور، لکھنؤ سے طبع ہو کر شائع ہوئی۔چوتھا ایڈیشن ۲۰۱۵ء میں شمس اللہ قادری اکیڈیمی، حیدرآباد سے زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔

حکیم سید شمس اللہ قادری کی اردوئے قدیم کا شمار دکنی ادب کی اولین تاریخوں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے عہد میں دستیاب مواد کی روشنی میں یہ تاریخ لکھی ہے لیکن بعد کے زمانے میں دکنی محققین کی کاوشوں سے بہت سے نئے حقائق سامنے آئے ہیں۔ان کی روشنی میں اردوئے قدیم کے بعض بیانات غلط ثابت ہوتے ہیں جیسے ''معراج العاشقین'' کو انھوں نے حضرت گیسو دراز کی تصنیف بتایا ہے جو درست نہیں ہے۔(اردوئے قدیم، حکیم سید شمس اللہ قادری، ۲۰۱۵ء، حیدرآباد، ص:۱۱۵)

حکیم صاحب نے امینؔ کو گجرات کا درباری شاعر بتایا ہے جب کہ وہ بیجاپور سے تعلق رکھتے تھے اور کسی دربار سے وابستہ نہیں تھے۔حکیم صاحب نے امینؔ کو گجرات کے مشہور عالم سراج الدین سید محمد حسینی (۸۸۰ھ) کا مرید قرار دیا ہے جب کہ ان کے مرشد کا نام شاہ عالم تھا۔ (ایضاً، ص:۴۸)

www.urduacademyts.com

حکیم صاحب نے ''قصہ فغفور چین'' اور ''گلدستہ عشق'' کو ایک ہی مثنوی قرار دیا ہے جب کہ یہ دو الگ الگ تصانیف ہیں اور انھوں نے اس مثنوی کا جو سنہ تصنیف ۱۱۵۹ھ بتایا ہے وہ درست نہیں ہے جب کہ صحیح تاریخ تصنیف ۱۰۷۷ھ ہے۔(ایضاً، ص:۱۰۵)

''اردوئے قدیم''میں بعض شعرا کے عہد غلط ہیں جیسے مقیمی کو مغل دور میں رکھا ہے جب کہ وہ عادل شاہی دور سے تعلق رکھتا ہے۔

حکیم صاحب نے بعض قدیم مخطوطات کی اولین اشاعت کے سنہ اور مقام اشاعت کی بھی نشاندہی کی ہے اور اردو زبان کے آغاز سے متعلق انھوں نے جو بحث کی ہے وہ لسانیات کے اصولوں کے مطابق نہیں ہے۔ ہر چند کہ ان کی تحقیق میں تسامحات بھی ہیں لیکن اس سے ان کی اس تصنیف کی اہمیت کم نہیں ہوگی کیونکہ یہ اپنے موضوع پر اولین کتابوں میں سے ایک ہے۔

قاموس الاعلام: حکیم صاحب کئی تاریخی، تحقیقی، ادبی، سوانحی کتب کے علاوہ اردو انسائیکلوپیڈیا کے مرتب اور مولف تھے۔ یہ کتاب اردو زبان کی پہلی انسائیکلوپیڈیا ہے جو ۱۹۳۵ء میں اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد میں طبع ہو کر شائع ہوئی تھی۔ جس میں مشرق و مغرب کے امیروں، بادشاہوں، ادیبوں اور شاعروں وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

بلوم ہارٹ نے انڈیا آفس لائبریری کے کتب خانے میں مخزونہ اردو زبان کے مخطوطات کی فہرست مرتب کی تھی اس پر حکیم صاحب نے ۱۹۲۹ء میں اردو زبان میں ترتیب دے کر ایک تمہیدی نوٹ لکھ کر انجمن ترقی اردو سے شائع کیا اور اس کی اغلاط کی نشاندہی بھی کی تھی۔

حکیم صاحب نے بعض تاریخی مخطوطات کی فہرست ''مخطوطات تاریخی'' کے نام سے مرتب کی جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ شعرائے اردو کے تذکرے کا ذکر بھی ملتا ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔

مذکورہ بالا مستقل تصانیف کے علاوہ بے شمار تاریخی، ادبی، علمی، تحقیقی اور سوانحی مضامین و مقالات حکیم صاحب کے ترشح قلم کی دین ہیں۔ میر احمد علی نے ان کے مقالات کی تعداد ۱۰۸ بتائی ہے۔(میر احمد علی، علاّمہ حکیم سید شمس اللہ قادری، جامعہ عثمانیہ، مقالہ ۱۹۶۹ء، ص:۲۴۰) لیکن ڈاکٹر ریحانہ کوثر نے ان کے ادبی مقالات کی تعداد کم و بیش ۱۱۴ بتائی ہے۔(مضمون مشمولہ ڈاکٹر ریحانہ کوثر، اردوئے قدیم، حکیم سید شمس اللہ قادری، ص:۲۴۴)۔ بلاشبہ انھوں نے بکثرت ادبی مضامین و مقالات قلم بند کیے ہیں جو فارسی اور اردو زبان و ادب، تاریخ ہند اور تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر اور دلچسپی کے مظہر ہیں جو موقر رسائل و جرائد میں طبع ہوئے جن میں سے بیشتر کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اردو کے قدیم عہد کو منظر عام پر لانے کے لیے حکیم صاحب نے جو اہم خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ بہت کم اہل اردو ان کی دیگر تصانیف سے آگاہ ہیں۔ بیشتر لوگ ''اردوئے قدیم'' کے متعلق بھی نہیں جانتے۔

حکیم صاحب کی علمی اداروں سے وابستگی: تصنیف و تالیف کے علاوہ حکیم صاحب نے جن علمی اداروں کی تاسیس

www.urduacademyts.com

میں سرگرم حصہ لیا وہ یہ ہیں۔ دکن آرکیالوجیکل سوسائٹی، جو انھوں نے ۱۹۱۱ء میں آثار قدیمہ سے اپنے گہرے شغف کے باعث قائم کی۔ حیدرآباد میں ۱۹۱۴ء میں 'محکمہ آثار قدیمہ' کے قیام میں بھی ان کی کاوشوں کا بڑا دخل ہے۔ حکیم صاحب ان دانشوروں میں شامل ہیں جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کے قیام کا خاکہ تیار کیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی جو تحریک چلائی گئی تھی اس کے محرکوں میں مولوی عبدالحق کے ساتھ حکیم صاحب کا نام بھی شامل ہے۔ حکیم صاحب جامعہ عثمانیہ کے محکمہ دارالترجمہ کی مجلس وضع اصطلاحات کے کئی سال تک رکن بھی رہے۔ علمی وادبی مصروفیات کے علاوہ وہ حیدرآباد کی ''عدالت العالیہ'' کے اراکین جیوری میں ایک رکن کی حیثیت سے بھی فائز رہے۔ ۱۹۳۸ء میں 'نواب لطف الدولہ میموریل کمیٹی' کے اسلامی علوم وفنون اور اسلامی ادبیات کی تحقیق واشاعت کا مرکز قائم کرنے میں بھی حکیم صاحب کی لگن اور جدوجہد شامل تھی۔ ۱۹۴۰ء میں حکیم صاحب نے اس کمیٹی کا نام بدل کر' نواب لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' رکھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ سے متعدد کتابیں شائع کی گئیں۔ حکیم صاحب ایشیاٹک ہسٹاریکل اینڈ نیومسماٹک سوسائٹیز کے ممبر بھی تھے۔

حکیم صاحب سے علمی استفادہ: حکیم شمس اللہ قادری بیک وقت کئی علوم اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ وہ نہ صرف دکن بلکہ برصغیر کے مستند مورخ اور بلند پایہ ادبی محقق تھے۔ بیرونی ممالک اور ہندوستان بھر کے ممتاز مورخ ومحقق اور ادیب ان کی تصانیف سے استفادہ اور ان کے مشوروں سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ نواب علی یاور جنگ حکیم صاحب کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ''شمس اللہ دکن کی ایک زندہ تاریخ ہیں۔'' اسی طرح نواب جیون یار جنگ نے کہا تھا کہ ''دکن کی تاریخ حکیم صاحب کے دم سے ہے۔ اگر یہ مرجائیں گے تو اس کا جاننے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔'' ہمعصر مصنفین اور محققین بھی حکیم صاحب کے علم، وسیع مطالعے اور ان کی تحقیقی نظر کے مداح اور معترف تھے اور مختلف امور میں ان سے مشاورت کرتے تحقیقی وعلمی مسائل میں حکیم صاحب سے مشورہ اور استفادہ کرنے والوں میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، پنڈت دتاتریہ کیفی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور نصیر الدین ہاشمی جیسے علماء وادباء شامل ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالؔی حکیم صاحب کو'' تاریخ کا امام'' کہتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد خود کو ان کے مقابلے میں طفل مکتب سمجھتے تھے۔ علمی وادبی مصروفیات جاری رکھتے ہوئے حکیم صاحب کی مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں اور تحریریں ہیں جو یہ ہیں:

بشارات احمدیہ، تذکرۂ فردوسی طوسی،، تاریخ ترقی وعلوم وفنون بزمانہ مسلمانان ہندوستان، مراۃ العجم، رود نیل، سلاطین مصر اور الجواہر الفرید، نواب سید لشکر خاں، عمادیہ، دیباچہ شاہ نامہ قدیم، جواہر العجائب (مقدمہ)، کتاب الملوک واخبار الماضین (مقدمہ) وغیرہ۔

حکیم صاحب کا کتب خانہ: حکیم سید شمس اللہ قادری نے اردو زبان وادب کے محققین کے لیے ایک عظیم اور لاجواب کتب خانہ اپنی علمی وادبی قیمتی میراث کے طور پر چھوڑا ہے۔

www.urduacademyts.com

حکیم صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ کتابیں خریدنے کے شوق کے باعث فقر و فاقے کی نوبت بھی ان پر آجاتی تھی۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں اردو، فارسی ،عربی کے علاوہ انگریزی اور دوسری زبانوں میں مختلف موضوعات پر نادر و نایاب کتابیں، مخطوطات اور رسائل کا بیش بہا ذخیرہ تھا۔ حکیم صاحب کی کتابوں کا یہ گنج ہائے گراں مایہ ابتدا میں ''نواب لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' میں علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے استفادے کی خاطر رکھا گیا تھا۔ بعد میں یہ مختلف مقامات پر منتقل ہوتا رہا' کچھ عرصہ پہلے مدینہ وقف کامپلکس نور خاں بازار (حیدرآباد) کی عمارت میں منتقل کیا گیا۔ اب وہاں سے بھی اس کی منتقلی عمل میں آئی اور آج کل یہ سارا نادر ذخیرہ ''ادارۂ ادبیات اردو'' حیدرآباد کے حوالے کیا گیا ہے تا کہ تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھا سکیں۔ ادارے میں ''گوشہ شمس اللہ قادری'' کے نام سے یہ نوادرات کا خزانہ محفوظ ہے۔ یہ علمی و ادبی اہم اثاثہ تحقیق کے لیے ایک عدیم المثال مخزن سمجھا جاتا ہے۔ اس کتب خانے سے آج بھی بے شمار اسکالرس استفادہ حاصل کرتے ہیں۔

اوراق ماسبق میں حکیم سید شمس اللہ قادری کی جن تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے وہ مطبوعہ ہیں اور علمی حلقوں میں مقبول و مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ حکیم صاحب کی متعدد تصانیف اور ہیں جن میں کچھ مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں جیسے ان کی نامکمل خود نوشتہ سوانح، حضرت ملا محمد باقر بن ملا محمد تقی مجلسی، ہندو دکن، شعراء اردو کے تذکرے وغیرہ۔ یہ تصانیف صمد خاں صاحب کی مشہور زمانہ اردو ریسرچ سنٹر میں محفوظ ہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری کو نام و نمود کا چسکا نہیں تھا۔ انھوں نے گوشہ نشینی میں علمی خدمت کی اور گوشہ نشینی میں ساری زندگی گزار دی۔ بحیثیت مورخ، بحیثیت ماہر آثار قدیمہ، بحیثیت ماہر مسکوکات اور بحیثیت محقق ادب (دکنی کا اولین محقق) ان کی خدمات اور کارنامے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن افسوس کہ ایسی عجوبہ روزگار ہستی پردۂ گمنامی میں چلی گئی ہے۔ ان کے کارنامے گلدستہ طاق نسیاں بنتے جارہے ہیں۔ ان کی شخصیت اور علمی و تحقیقی کارناموں کا مبسوط جائزہ اور ان کی قدر و قیمت کا تعین ضروری ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر حکیم رئیس فاطمہ
فلاٹ نمبر 201' پلاٹ نمبر 121' ایمپلائز کالونی
سیری لنگم پلی' منڈل آفیس' حیدرآباد۔ 019 500 (تلنگانہ)
موبائل: 9948125832

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف' خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروا رہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔

ادارہ قومی زبان

www.urduacademyts.com

اُردو زبان اور اس کا رسم الخط

ہندوستان میں پیدا اور پروان چڑھی اُردو فی الوقت پچاس سے زیادہ ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہماری مشترکہ تہذیب ، وراثت اور قلوب کو جوڑنے والی اُردو زبان کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہے۔تحریکِ آزادی میں اس شیریں، دلچسپ، دلکش اور محبت کی زبان نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اُردو ہندوستان کی مشترکہ وراثت اور گنگا جمنی تہذیب کی پہچان ہے،لیکن کچھ تنگ نظر افراد کو یہ ایک خاص فرقہ کی دکھائی دینے لگی ہے۔سیاسی میدان میں سرگرداں اور برسراقتدار جماعت کے متعصب کردار اُردو کی فلاح و بہبود اور ترقی کی راہیں مسدود کرنے میں لگے ہیں۔ان حالات میں بلاتفریق مذہب وملت جہاں دیدہ حضرات کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اُردو کی نشوونما، آبیاری اور جاودانی کے لیے نہ صرف آگے آئیں، بلکہ نہایت ہی خندہ پیشانی سے فرقہ پرست طاقتوں اور تنگ ذہنیت کے شکار افراد کو آئینہ دکھاتے ہوئے اُنھیں راہِ راست پر لانے کا عزم کریں۔

اُردو دنیا میں یہ بات تسلیم کی جاچکی ہے کہ اُردو ایک جسم اور دیگر زبانیں اُس کا زیور ہیں۔ زیور سے جسم کی خوبصورتی میں اضافہ تو ہوسکتا ہے،لیکن زیور کو کسی بھی صورت میں جسم میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔توجہ طلب بات یہ ہے کہ کسی زبان کو زندہ و جاوید بنائے رکھنے میں اُس کے رسم الخط کا اہم کردار ہوتا ہے۔ بھلے ہی اُسے کسی دوسری زبان سے مستعار لیا گیا ہو۔ ہندی کا رسم الخط دیوناگری ہے، جبکہ اُردو کا رسم الخط فارسی وعربی ہے۔رسم الخط سے بے توجہی نہ صرف زبان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے، بلکہ ایک نہ ایک دن وہ زبان اَدبی اُفق سے غائب بھی ہوسکتی ہے۔اُردو کا رسم الخط اس کی روح ہے۔ بدن سے روح کے الگ ہونے کی شکل میں زبان کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔ اُردو کے خلاف طرح طرح کی سازشیں چلائی جارہی ہے۔سیاست داں اُردو کی ترقی کے لیے جہاں اس کا رسم الخط بدل کر دیوناگری کرنے کے مشورے دیتے رہے ہیں، وہیں اُردو دوستی کا دَم بھرنے والے مبتدی اَدیب وشعرا اس سے اپنا دامن بچاتے نظر آرہے ہیں۔اس صورت کو اُردو زبان کے لیے نیک فال نہیں کہا جاسکتا۔

غور کریں تو اُردو کی مخالفت کوئی نئی بات نہیں ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ 1857 کی جنگِ آزادی کے زخم مندمل بھی نہیں ہوئے تھے کہ دس برس بعد 1867 میں تعصب پسند عناصر نے اُردو اور ہندی کا تنازعہ پیدا کردیا۔اس بابت ایک فرقہ کے لوگوں نے بنارس میں لسانی تحریک کا آغاز کیا۔ان کا مقصد فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اُردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط میں تحریر کی جانے والی ہندی کو سرکاری اور عدالتی زبان بنانا تھا۔تحریک کو پُرزور طریقہ سے چلانے کے لیے نہ صرف الہ آباد میں صدر دفتر بنایا گیا، بلکہ اکثریتی طبقہ کے لوگوں کو اس مہم سے جوڑنے کی غرض سے قومی سطح پر کئی ورکنگ

www.urduacademyts.com

کمیٹیاں بھی تشکیل دی گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو اور ہندی کے قضیے میں جگہ جگہ فسادات شروع ہو گئے اور زبانوں کو مذہب سے جوڑنے کے سبب دو قوموں کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت آ گئی۔ اس کے بعد ہندو مسلم اتحاد کا دم بھرنے والے افراد کے نظریات میں تبدیلی آ گئی اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پڑی۔ 1930 میں ڈاکٹر محمد اقبال نے الہ آباد کے اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں دو قومی نظریہ کو پیش کیا۔ بعد میں اِسے مزید تقویت حاصل ہوئی۔ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر 1947 میں ملک آزاد ہونے کے ساتھ تقسیم بھی ہو گیا۔ مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے نام پر دُنیا کے نقشہ پر نیا ملک پاکستان تو وجود میں آ گیا، لیکن اس کی بڑی قیمت چکانی پڑی۔ کثیر تعداد میں عوام کے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے جانے کے دَوران بھڑک اٹھے فسادات نے انسانی جذبات، احساسات، مساوات اور التفات کو بُری طرح مجروح کر دیا۔

اُردو کے حوالے سے اِس کڑوی سچائی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی سے قبل ہی 1936 میں اُتر پردیش میں ڈاکٹر سمپورنانند نے اُردو کے خلاف ذہن سازی کی مہم چھیڑ دی تھی۔ 1938 میں بابائے قوم مہاتما گاندھی اور آزادی کی جدوجہد میں سرگرم عمل رہنے والی کانگریس پارٹی کے اہم رکن بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ساتھ آزاد ہندوستان کی قومی زبان کو لے کر ایک معاہدہ ہوا، جس میں طے پایا کہ آزاد ہندوستان کی قومی اور سرکاری زبان ہندی یا اُردو نہ ہو کر 'ہندوستانی' ہوگی، جو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ معاہدے پر مہاتما گاندھی، ڈاکٹر راجیندر پرساد اور مولوی عبدالحق نے دستخط کئے، لیکن آزادی کے بعد اِس سمجھوتے کو پسِ پُشت ڈال دیا گیا۔ قومی زبان کے مسئلہ پر اُردو کے تئیں لوگوں کے نظریات میں خاصہ فرق محسوس کیا گیا۔ دستور ساز اسمبلی کے ارکان بھی ہندی اور اُردو کے نام پر منقسم ہو گئے۔ یہاں تک کہا گیا کہ اُردو ملک کی تقسیم کے ساتھ پاکستان چلی گئی۔ اب ہندوستان سے اس کا کوئی مطلب نہیں۔ ملک کی قومی زبان ہندی ہونی چاہئے۔ کانگریس ہاؤس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں اُردو اور ہندی میں سے کسی ایک کو قومی زبان تسلیم کرنے کے لیے رائے دہی کی نوبت آ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ دونوں زبانوں کے حق میں برابر ووٹ آئے۔ حتمی فیصلہ کی ذمہ داری صدرِ مملکت ڈاکٹر راجیندر پرساد پر تھی۔ اُنھوں نے اپنے خصوصی و فیصلہ کن ووٹ کا استعمال ہندی کے حق میں کیا۔ اس طرح ایک ووٹ کی سبقت سے دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی بھاشا، ہندوستان کے آئین میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

اُردو اور ہندی کا مسئلہ و نظریاتی تنازعہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ فرقہ پرست، کینہ پرور اور تنگ نظر عناصر نے اُردو کو ایک خاص مذہب سے جوڑنے کی غیر ضروری مہم شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک خوبصورت، پُرلطف اور عوامی زبان، پراگندہ ذہنیت کا شکار ہوگئی۔ مرکزی حکومت کی سرد مہری اور جانب دارانہ رویہ کے علاوہ صوبائی سرکاروں نے بھی چشم پوشی سے کام لیا۔ اُونچے عہدوں پر فائز تعصب و تنگ ذہنیت کی

www.urduacademyts.com

عینک لگائے افسران نے غیر محسوس طریقہ سے عرش تک رسائی کرنے والے طائرِ اُردو کے پَر نچے کرنے شروع کردئے۔ اُردو میڈیم میں تعلیم دینے والے اسکولوں میں اُردو ٹیچروں کا بحران پیدا کیا گیا۔ اُردو اساتذہ کی تقرری جان بوجھ کر ہندی میڈیم اسکولوں میں کی گئی اور اُن سے دوسری زبان و مضامین پڑھوانے کا کام لیا گیا۔ اُردو میڈیم اسکولوں میں اُردو اساتذہ کی کمی کو حیلہ بنا کر طلبا کو دوسرے میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ اس کے بعد بنیادی تعلیم کے زیادہ تر اُردو میڈیم اداروں کو یکساں نظام تعلیم کے حوالے سے ہندی میڈیم اسکولوں میں تبدیل کردیا گیا۔ اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے والوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کر لینی چاہئے کہ اگر اُردو صرف اور صرف مسلمانوں کی زبان ہوتی، تو ورکنگ کمیٹی کی ووٹنگ میں اُردو کی حمایت میں ووٹوں کی تعداد کسی بھی صورت میں 77 نہ ہوتی۔ غیر مسلم ممبران کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی۔ کیا یہ نتیجہ اُردو کے مذہبی اور ایک فرقہ کی بتانے کی نفی کا بین ثبوت نہیں ہے؟ کئی لیڈران اور غیر جانب دارانہ روایت کو برقرار رکھنے والے بے شمار ہندوستانیوں کے ذریعہ اُردو کی طرف داری سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو مذہبی زبان نہیں، بلکہ عوامی زبان ہے۔

ماضی میں طلبا و طالبات کے لیے سہ لسانی فارمولہ تیار کیا گیا تھا۔ اس میں دیگر کئی زبانوں کے ساتھ جہاں اُردو کو شامل کیا گیا، وہیں سنسکرت کو بھی فارمولے میں رکھا گیا تھا، جبکہ سنسکرت لازمی مضمون ہندی کے ساتھ الیمینٹری کی شکل میں پہلے سے موجود تھی۔ مادری زبان ہندی والے طلبا کو سنسکرت میں کوئی دقت نہیں تھی، لیکن اساتذہ کے فقدان کے سبب مسلمان طلبا کو اپنی مادری زبان اُردو کی جگہ سنسکرت پڑھنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ اسی طرح مرکزی حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی 2020 کے لسانی فارمولے کے تحت بنیادی تعلیم کے لیے صوبائی زبان (مادری) کو پہلی، قومی زبان ہندی کو دوسری اور انگریزی کو تیسری زبان کے طور پر رائج کیا گیا ہے۔ مادری زبان کی فہرست سے اُردو کا نام غائب ہے۔ اُردو کو فارمولے سے الگ رکھنا قابل اعتراض تو ہے ہی، باعث اضطراب بھی ہے۔ اُردو کے تئیں جانب دارانہ رویہ پر رام پرکاش کپور کا کہنا ہے۔

''ملک کے بہترین دماغوں نے بڑی محنت سے سہ لسانی فارمولہ تیار کیا تھا جس کی رُو سے شمالی ہند کے ہر طالب علم کے لیے اُردو کو تیسری زبان کے طور پر پڑھنا لازمی تھا، لیکن نہایت چالاکی سے سنسکرت کو 'قدیم کلاسیکی زبان' کے زمرے سے ہٹا کر 'جدید ہندوستانی زبان' بنا کر تمام طلبہ کو تیسری زبان کے طور پر سنسکرت لینے پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ 'المینٹر ی سنسکرت' ہندی زبان کے نصاب میں پہلے ہی سے شامل ہے۔ چونکہ اسکولوں میں اُردو پڑھانے کا انتظام ہی نہیں ہے، اس لیے مسلمانوں کو مادری زبان کے طور پر بھی ہندی پڑھنی پڑتی ہے۔''

اُردو کو حاشیہ پر دھکیلنے کے لیے اُردو داں حضرات بھی کم ذمہ دار نہیں ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کا یہ ذہن بن گیا ہے

www.urduacademyts.com

کہ بغیر غور وخوض کئے خود کو ہر الزام سے بری الذمہ ٹھہرا لیتے ہیں۔ ہونا تو یہ تھا کہ ایک تحریک کی شکل میں اُردو کو زندہ رکھنے کی کاوشوں کو تیز تر کیا جاتا، جس سے نئی نسل فیض یاب ہوتی، لیکن ایسا ہو نہیں ہوا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ ہم اُردو کا استعمال وسیلۂ اظہار کے طور پر کم ہوتے دیکھنے کے باوجود خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ اُردو کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے ملی تنظیمیں بھی سنجیدہ نہیں ہیں۔ قوم وزبان کی صحیح رہنمائی کرنے کا دم بھرنے والی ان تنظیموں کا رویہ بے اعتنائی کا شکار ہے۔

اِسے حکمرانوں کی بے حسی، سیاستدانوں کی عصبیت زدہ سوچ اور اُردو کو مدارس وخانقاہوں کی زبان ماننے والے تنگ نظر افراد کی بے رخی ہی کہا جائے گا کہ اُردو سے ہمدردی کے نام پر اس کے رسم الخط پر حملہ کیا جارہا ہے۔ فارسی رسم الخط سے بیگانگی کے ساتھ اس کی تہذیبی وثقافتی روایات اور اقدار کو مسخ کرنے کی مہم چلائی جارہی ہے۔ نئے لکھاری اور شعرا اِس عیاری کو سمجھنے کی بجائے بڑی آسانی سے دام فریب میں پھنس رہے ہیں۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ زیادہ تر نوجوانوں کی نگاہ میں ہندی کے دیوناگری رسم الخط کے سامنے اُردو کے فارسی رسم الخط کی اہمیت ختم ہوگئی ہے۔ اس بنا پر جہاں غیر اُردو داں حضرات کو اُردو زبان کے قریب لانے کی کاوشیں پروان نہیں چڑھ رہی ہیں، وہیں اُردو کو دیوناگری لباس پہنا کر خودستائی کا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا جارہا ہے۔ اِس کے مضمرات اور دوررس نتائج سے بے خبر رہنا یقینی طور پر نقصان دہ ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کوئی بھی زبان اپنے رسم الخط سے پہچانی جاتی ہے۔ یہی اس کے زندہ ہونے کا ثبوت بھی ہے۔

انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں پرتاپ نرائن مشر نے 'ہندی، ہندو، ہندوستان' کا نعرہ دیا تھا۔ اُردو کا رسم الخط تبدیل کر دیوناگری کرنے کا مشورہ اسی کی عکاسی کرتا ہے۔ پرتاپ نرائن مشر، سوامی دیانند سرسوتی، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ، ایودھیا پرساد کھتری، بھارتیندو ہریش چندر اور شردھا رام پھلوری وغیرہ نے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا اور ہندی آندولن کی تحریک شروع کی۔ ہندی پرچارنی سبھا سے منسلک اُردو زبان کو ہندی کی ایک شکل ماننے والے لوگوں نے مسلمانوں کو اُردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کا مشورہ دیا۔ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تعصب ایک ذہنی کیفیت ہے۔ اس میں مبتلا شخص خود سے غیر مشابہ لوگوں کو دہشت اور بے یقینی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ دوسروں کے بارے میں تسلی بخش معلومات حاصل کئے بغیر ان کے مذہب، ذات، نسل، رنگ، خطہ یا کسی دیگر شناخت کی بنا پر ذہنی کوفت کا شکار ہوجاتا ہے۔ بغض وحسد کی یہی چنگاری اسے مخاصمت پر اُکساتی ہے۔ کچھ ایسی ہی ناانصافی اُردو زبان کے ساتھ ہوئی۔ اُردو کو نظرانداز کر حاشیہ پر کھسکانے کے سلسلے نے اپنا رنگ دکھایا۔ اُردو کو فرقہ پرستی اور دہشت گردی کی عینک سے دیکھنے کے عادی حضرات اُردو کی ترقی کے لیے اس کا رسم الخط دیوناگری کرنے کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔

www.urduacademyts.com

یہ کوتاہ اندیش اتنا تو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندی میں نقاط لگانے کا رواج نہیں ہے، لیکن اسے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اُردو، فارسی اور عربی کے بہت سے الفاظ کی ادائیگی اور درست تلفظ کے لیے نقطے لگانا ضروری ہے۔ کتنے ہی الفاظ ایسے ہیں جنہیں دیوناگری رسم الخط میں لکھنے سے اُن کے معنی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ 'خدا' لکھنا ہے۔ ہندی میں 'کھ' کے نیچے نقطہ لگانے سے 'خ' بنتا ہے۔ چونکہ ہندی میں نقطہ لگانے کا چلن نہیں ہے اور نہ ہی ہندی کے پیروکار نقطہ لگانا پسند کرتے ہیں، اس لیے لفظ 'خدا' کو ہندی میں 'کھدا' لکھا اور پڑھا جائے گا۔ صحیح حروف 'خ' کے لیے 'کھ'، 'ذ'، 'ز'، 'ژ'، 'ض' اور 'ظ' کے لیے 'جے'، 'غ' کے لیے 'گے'، 'ف' کے لیے 'پھ'، اور 'ق' کے لیے 'کے' تحریر کرنے سے خانہ (گھر) کو کھانا (خوراک) ، ذلیل (کمینہ) کو جلیل (اعلیٰ) ، زانی (زنا کار) کو جانی (معشوق)، اژدہا (اجگر) کو اجدہا (بہت سے دادا)، ظفر (فتح) کو جفر (غیب کا حال بتانے والا علم)، ضعیف (بوڑھا) کو جعیف (مہمل) ، غل (شور) کو گل (پھول)، شدید (زیادہ) کو سدید (مضبوط)، شریر (شرکش) کو سریر (مسند)، شاہی (ملوکیت) کو ساہی (خارپشت)، فضول (بیکار) کو پھجول (مہمل)، ذہن (دماغ) کو جہن (عذاب کی جگہ)، ضرب (چوٹ) کو جرب (خارش) ، زنگ (دھات کا میل) کو جنگ (لڑائی) اور خول (غلاف) کو کھول (کھولنا) لکھا اور پڑھا جائے گا۔ ایسا کرنے سے اُردو کی لطافت، شیرینی ، دلکشی، خصوصیت اور جاذبیت کا متاثر ہونا یقینی ہے۔ کتنے ہی سیاسی اور غیر سیاسی افراد کو اپنی تقاریر میں اُردو و فارسی کے الفاظ کو غلط تلفظ کے ساتھ استعمال کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ زیادہ تر ہندی اخبارات میں 'مخالفت' کے لیے 'کھلاپھت' (خلافت)، نماز 'ادا' (عمل میں لانا) کے لیے 'عطا' (بخشش) اور 'وبال' (آفت) کے لیے 'بوال' (متو، متوڑا) جیسے غلط الفاظ استعمال کئے جا رہے ہیں۔ کوئی تو بات ہے جو طوطئ ہند، ملکۂ ترنم اور مشہور و معروف فلمی گلوکارہ لتا منگیشکر نے دلیپ کمار کی صلاح پر اُردو زبان سیکھی تھی۔ وہ آج بھی اپنی بین الاقوامی شہرت اور کامیابی کا سہرا اُردو زبان کو دینے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ بالی ووڈ کے مشہور ایکٹر آنجہانی ٹام آلٹر اُردو کو اپنی مادری زبان ہی نہیں کہتے تھے بلکہ اُردو میں بات کرنے اور مکالمے بولنے کو بے حد پسند کرتے تھے۔ مرکزی حکومت میں وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پرکاش جاوڑیکر اُردو سے بے حد متاثر ہیں۔ اُنھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کی تئیس ویں جنرل باڈی کی میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا:

''اُردو زبان مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میں یہ زبان سیکھوں گا اور اِس کے لیے کام بھی کروں گا۔''

کثیر الجہات شخصیت کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی مادری زبان پنجابی ہونے کے باوجود ان کے اُردو سے عشق و تعلق کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے جشن کنور مہندر سنگھ بیدی کمیٹی دہلی کے زیر اہتمام 1986 میں چھپی

www.urduacademyts.com

اپنی خودنوشت سوانح عمری 'یادوں کا جشن' میں اُردو کی بابت فخریہ انداز میں کچھ اس طرح سے بیان کیا۔

''مجھے اپنی شاعری پر ناز ہے، لیکن اس بات پر یہ فخر ضرور کرتا ہوں کہ مجھے خدا تعالیٰ نے اُردو زبان کی خدمت کرنے کا موقع دیا اور توفیق عطا فرمائی اور تا دم آخر میری کوشش رہے گی کہ میں اُردو کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرسکوں۔ اُردو زبان سے مجھے قدرتی لگاؤ ہے اور جب یہ کم توجہی، تغافل، سوتیلے پن، اور تعصب کا شکار ہوتی ہے تو دِل دکھتا ہے، لیکن اس زبان نے آبِ حیات پی کر جنم لیا ہے۔ سینکڑوں آندھیاں آئیں' ہزاروں طوفان اُٹھے، مگر اس کا چراغ بجھنے نہ پایا بلکہ پہلے سے زیادہ تابانی سے عوام کو منور کرتا رہا۔ میری مادری زبان پنجابی ہے، کالج میں، میں نے انگریزی میں اعزاز حاصل کیا لیکن محبت اُردو سے کرتا ہوں۔ اُردو سے مجھے کیوں محبت ہے یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔ جب میں ساہیوال گورنمنٹ پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا، تو دو ماسٹر ہماری جماعت کو پڑھاتے تھے۔ ایک مولوی عبدالمجید تھے جو اردو پڑھاتے تھے دوسرے ماسٹر بشمبر داس تھے جو حساب وغیرہ پڑھاتے تھے۔ دونوں کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مولوی عبدالمجید نہایت نیک، ہمدرد اور مشفق استاد تھے۔ ماسٹر بشمبر داس بہت زیادہ سخت تھے اور بچوں کو اپنے نیم پاگل بیٹے کی شکایت پر بھی پیٹ ڈالتے تھے۔ ان دونوں کے رویہ کو دیکھ کر مولوی صاحب سے محبت اور ماسٹر جی سے نفرت ہوگئی۔ چونکہ مولوی صاحب اُردو پڑھاتے تھے، اُردو سے بھی محبت ہوگئی۔ چنانچہ میں نے اُردو کی جانب زیادہ توجہ دی اور بہت جلدی اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی۔''

اُردو زبان کا رسم الخط فارسی سے تبدیل کردیوناگری کرنا ممکن نہیں ہے۔ خداداد ترنم کے زعم میں جو مبتدی اور نوجوان شعرا دیوناگری رسم الخط کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کر رہے ہیں، اُن کی زبان سے نکلنے والے الفاظ، دیر سویر غلط تلفظ کا باعث بن کر زبان کی شیرینی سے محروم ہوجائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کل تک جو مشاعرے اُردو زبان کی مٹھاس، تلفظ، اَدب، شعریت، ثقافت، تہذیب، تمدن اور ہم آہنگی کے لیے جانے جاتے تھے، مستقبل میں وہ تمام خوبیاں حاشیہ پر چلی جائیں گی۔ ایسے ناگفتہ بہ دَور میں اگر نئی نسل کے لیے اُردو کی تعلیم کا بہتر بندوبست نہ کیا گیا تو اُردو گھرانوں سے بھی اس کا اخراج ہوجائے گا اور اُردو مدارس و خانقاہوں تک سمٹ کر رہ جائے گی۔ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صرف زبان سے بولنے اور کانوں سے سننے بھر سے کوئی بھی زبان زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ مثال کے طور پر کسی دیوار پر لکھا نعرہ یا عبارت انگریزی، چینی، جرمنی، عربی، پنجابی، سندھی اور سنسکرت سمیت دُنیا کی جس زبان کے رسم الخط میں تحریر کی جائے گی، اُسی میں پڑھی جائے گی۔ اسی طرح ہندوستانی زبان کا کوئی جملہ دیوناگری رسم الخط میں لکھنے پر ہندی زبان کا تسلیم کیا جائے گا اور فارسی رسم الخط میں لکھنے پر یہ جملہ اُردو زبان کا کہلائے گا۔ اس سے قبل کہ رسم الخط کی

www.urduacademyts.com

جانب سے برتی جارہی لاپرواہی نقصان دہ ثابت ہواور اُردو لکھنے، پڑھنے، بولنے و سننے کا دائرہ مدارس تک محدود ہوکر رہ جائے،اس جانب خصوصی توجہ دینے کی درکار ہے۔

بدقسمتی سے تنگ ذہنیت کے شکار تعصب پسند افرادکا رویہ اُردوزبان کے لیے کبھی منصفانہ نہیں رہا۔ملک کی تقسیم کے بعد غیر مسلموں کی اس قربانی کودرکنار کردیا گیا، جو اُنھوں نے اُردو کی ترقی وترویج کے لیے پیش کیں۔اپنے خون پسینے سے اُردوکو پروان چڑھانے والوں کی بڑی تعداد ہندوؤں کی ہے۔اس کے باوجود اُردوکومسلمانوں کی زبان قرار دیا گیاہے۔حالانکہ یہ تماشہ دانستہ طور پر کیا گیا،لیکن خاموشی کا لبادہ اُوڑھے مسلمان ٹکرٹکر دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکے۔اُن کے اندر کہیں سے کہیں تک بھی اس بے ہودہ الزام کے تردید کی سکت دکھائی نہیں دی۔اتنا ہی نہیں وہ اپنی جانب دھکیلی گئی اُردوکوصمیم القلب سے اپنانے کی جرأت بھی نہیں کرسکے۔وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے گھروں سے اُردوکا اخراج دیکھنے کومجبور ہیں۔وہ اپنی اولاد سے بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ شوق سے اپنے بچوں کوانگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم دلوائیں،لیکن اُن کے لیے گھر پرکسی منشی،حافظ، مولوی یا ٹیوٹر کا بندوبست ضرور کردیں۔اس بے گانگی کی وجہ سے کشمکش کی شکار اُردوکو نقصان پہنچ رہا ہے۔آزادی کے بعداُردو کے ساتھ جوسوتیلا برتاؤ ہوا،اُسے کسی بھی صورت میں مناسب نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔حالانکہ ایک وقت ایسا بھی گزرا، جب کرناٹک، تمل ناڈو اور مغربی بنگال میں ہندی کی زبردست مخالفت کی گئی،لیکن اُردودشمنی کہیں سے کہیں تک نظر نہیں آئی۔پھرایسا کیا ہوا کہ اُردو کی مخالفت کرتے ہوئے وہ سلوک کیا گیا، جوکسی دوسری زبان کے ساتھ نہیں ہوا۔اُردوکو دفاتر سے نکال کر باہرکا راستہ دکھادیا گیا۔اُترپردیش، بہار، آندھراپردیش، جھارکھنڈ،مغربی بنگال،تلنگانہ،جموں وکشمیراور دہلی میں اُردوکودوسری سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے باوجود اُردوزبان ترقی کے مراحل طے کرنے میں بُری طرح ناکام ثابت ہورہی ہے۔اُردو کے لیے برسراقتدار جماعتوں کارویہ منصفانہ نہیں ہونے سے اُردوبنیادی سطح پر ہی لڑکھڑاتی نظر آتی ہے۔اِس بابت رام پرکاش کپور کا بیان حقیقت کے قریب نظر آتا ہے۔

’اُردوکشی کا دَورتو سرکاری سطح پرآزادی کے فوراًبعد ہی شروع ہوگیا تھا۔آج کے بیشتر لوگوں نے وہ دَورنہیں دیکھا جب راتوں رات کئی بڑے شہروں میں سڑکوں کے نام بدل دئے گئے تھے۔چھ ماہ کے اندراندرتمام اسکولوں،کالجوں سے اُردو خارج از نصاب کردی گئی تھی۔ ہزاروں اُردو میڈیم اسکول بندکردئے گئے تھے یااُن کا میڈیم بدل دیا گیا تھا۔تمام ریلوے اسٹیشنوں سے اُردو کی کتابیں اور رسائل غائب ہوگئے تھے۔یہ وہ زمانہ تھا،جب اُردوکا مطالبہ کرنے والا اینٹی نیشنل سمجھا جاتا تھااورخفیہ پولیس اُس کے گھر چکر لگانا شروع کردیتی تھی۔اس ماحول میں آزادی کے بعد آنے والی پہلی نسل اُردو سے ناواقف ہوگئی تھی۔1951 میں سرکاری زبان کے قانون کے نفاذ کے بعداُردوکوعدالتوں اورسرکاری دفتروں

www.urduacademyts.com

سے بھی خارج کر دیا گیا تھا۔لیکن اہلِ اُردو خاموشی سے یہ سب ناانصافیاں دیکھتے رہے۔''

سرکاری سطح پر بچوں کی بنیادی تعلیم کے لیے صرف اسکول کھولنا ہی کافی نہیں ہے، اُن کی بہتر تربیت کے لیے قابل اور اعلیٰ درجہ کے اساتذہ کی بھی ضروری ہے۔لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا دعویٰ کرنے والا ملک کا سب سے بڑا صوبہ بھی کسوٹی پر کھرا نہیں اُتر رہا ہے۔حالات کی سنگینی کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے کہ جب پرائمری اسکولوں میں ہندی نصاب سے تعلق رکھنے والی برسوں سے اساتذہ کی خالی پڑی اسامیاں ہی پُر نہیں ہو پا رہی ہیں، تب اُردو کی تعلیم دینے والے ٹیچروں کی تقرری کس طرح ممکن ہے۔2016 کے اواخر تک اُتر پردیش کے بیسک تعلیمی اداروں میں اُردو کی 4000 اسامی سمیت 14165 ٹیچروں کی جگہیں خالی تھیں۔2020 میں خالی اسامیوں کی تعداد بڑھ کر 69,000 ہوگئی۔سُپریم کورٹ کے حکم کے بعد یوگی آدتیہ ناتھ حکومت کی جانب سے میرٹ اور رزرویشن کی بنیاد پر 16/اکتوبر 2020 کو پہلے مرحلہ میں 31,277 اساتذہ کی تعیناتی کی گئی۔ہائر سیکنڈری اسکولوں میں بھی 3317 اسامیاں پُر کی گئیں۔اس طرح کل 34478 ٹیچروں کی تقرری کی جا چکی ہے، لیکن تین برس گزرنے کے باوجود اُردو اساتذہ کی تقرری نہیں کی گئی۔ 2014 میں عزت مآب سپریم کورٹ کے ذریعہ اُردو کو بطور دوسری سرکاری زبان تسلیم کرنے کے فیصلہ کے باوجود اُردو کو ایوان کی زبان نہیں بنایا گیا۔اِسے حکومت کی لاپرواہی یا پھر تنگ نظری کا جیتا جاگتا ثبوت ہی کہا جائے گا۔

اُردو کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اُردو کے نام پر قائم مرکزی وصوبائی ادارے اپنی ذمہ داری سے فرار حاصل کرنے کی بجائے اسے فرض سمجھ کر انجام دیں۔تعلیم گاہوں سے سبکدوش ہونے والے اساتذہ اپنے حلقوں میں سرگرم رہ کر اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔لوگوں کی ذہن سازی کرتے ہوئے اُنھیں کاروباری بورڈ، گھر کے دروازے پر لگی نام کی تختی، شادی و دیگر تقریبات کے دعوت نامے اُردو میں شائع کرانے کے لیے بیدار کریں۔کئی انگلش میڈیم اسکولوں میں اُردو بحیثیت ایک مضمون پڑھائی جاتی ہے۔جہاں نہ پڑھائی جاتی ہو، وہاں کے پرنسپل اور انتظامیہ سے مل کر اُردو کی تعلیم کا دباؤ بنائیں۔اگر یہ ممکن نہ ہو تو والدین اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے کے لیے گھر پر ٹیوشن لگائیں۔فضا مسموم ضرور ہے، لیکن، اگر دانشورانِ قوم، برادرانِ وطن اور باصلاحیت اشخاص اس خوش گفتار زبان کی حمایت میں سنجیدگی سے کام کریں، تو یہ اُردو اور اس کے رسم الخط کی بقائے دوام کے لیے کافی ہے۔

☆☆☆

ایم اے کنول جعفری
127/2، جامع مسجد، نینڈرو
تحصیل دھام پور ضلع بجنور (یو۔پی۔) 246761
موبائل: 09917767622

مضامین

www.urduacademyts.com

ڈاکٹر حسن الدین احمد کا اردو ترجمہ ''شریمد بھگوت گیتا''

ہر مذہب میں اس کی بنیادی اور مقدس کتابوں کو خصوصی طور پر اہمیت حاصل ہوتی ہے اس لئے کہ انہیں بنیادی کتابوں کی بدولت اس مذہب کے ماننے والوں کو تعلیمات و ہدایات فراہم ہوتی ہیں جو ان کتابوں میں موجود ہوتی ہیں اور انہیں تعلیمات و ہدایات سے انسان عموماً اپنی زندگی کے خطوط متعین کرتے ہیں اور ان کی روشنی میں مشاہراہِ زندگی پر نہ صرف چلتے ہیں بلکہ سلاست روی کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اور بات کہ طبیعت میں شر کے مادہ کے باعث بعض انسان راہِ ہدایت کو چھوڑ کر اپنے لئے گمراہی اور ضلالت کے راستہ کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے۔ اسی لئے علامہ اقبالؔ نے درست کہا ہے:۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی

جیسے مذہبِ اسلام کے مطابق مختلف صحیفے اور توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید مقدس کتابیں نازل ہوئی ہیں اسی طرح ہندومت کی اہم کتابوں میں چاروید، اپنسد، بھگوت گیتا اور آگم شامل ہیں بقیہ کتابوں سے قطعِ نظر اس مضمون میں ''بھگوت گیتا'' کے ایک اہم ترجمہ ''شریمد بھگوت گیتا'' کا مختصر تعارف اور جائزہ پیش کیا جاتا ہے جس کے مترجم ڈاکٹر حسن الدین احمد ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مقدس کتاب ہونے کے باعث بھگوت گیتا کے مختلف تراجم تقریباً ہر زبان میں کئے گئے۔ اس کتاب کو سب سے پہلے ابوالفیض فیضی نے فارسی نظم میں ڈھالا۔ اس کے بعد دوسروں نے اس کتاب کے بکثرت ترجمے کئے۔ اردو میں اگر تحقیق کی جائے تو اس موضوع پر تقریباً پچاس ترجمے بلکہ اس سے زائد مل جاتے ہیں جن میں سے چند تراجم یوں ہیں:

(1) شریمد بھگوت گیتا رہیہ (از بال گنگا دھر تلک۔ جی مہاراج) نرائن دت سہگل اینڈ سنز لاہور۔ 1920۔ (2) بھگوت گیتا از محمد اجمل خان۔ ادارہ نواسِ الہیہ ۔ الٰہ آباد۔ 1935۔ (3) بھگوت گیتا منظوم از تمنا لکھنوی۔ منشی نول کشور لکھنؤ۔ 1912۔ (4) شری بھگوت گیتا عرف فخرن گیان۔ از پنڈت پرشاد۔ پیترز سنگھ راج کپور۔ 1997۔ (5) شریمد بھگوت گیتا منظوم۔ از شری جیگو پال چوپڑا۔ 1983ء۔ (6) بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ۔ از صلو چودھری۔ مطبع یلیم آڈیسی۔ 2013ء۔ (7) گیان گنگا یعنی بھگوت گیتا منظوم۔ از رگھونندن سنگھ ساحرؔ دہلوی، کیشیب چندر منجال ڈنکارا بلڈنگ دہلی، 1947ء۔ (8) شریمد بھگوت گیتا۔ از راجندر پریمی۔ سگما انٹر پرائز زنئی دہلی، 2009ء۔ (9) شریمد بھگوت گیتا۔ از ڈاکٹر اجے مالوی۔ ناگری پریس، اللہ پور، الٰہ آباد یوپی۔ 2006ء۔ (10) بھگوت گیتا۔ از پنڈت لکشمی نرائن مصرا۔ ناشر ہری کشن مہتاب وزیر اعظم اڈیسہ مع تعارف مولوی عبدالحق

www.urduacademyts.com

بابائے اردو۔(11)شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ نظم۔از پنڈت رام پرشاد۔منشی نول کشور لکھنؤ۔1906ء۔(12) بھگوت گیتا منظوم۔ از منور لکھنوی عرف نسیم عرفان۔شورہ بک ڈپو دہلی، 1961ء،جدید ایڈیشن بھگوت گیتا موسومہ نسیم عرفان۔از منور لکھنوی۔ آدرش کتاب گھر دہلوی۔ 1955ء۔ (13)شریمد بھگوت گیتا یعنی مخزنِ اسرار۔ اردو ترجمہ از پنڈت دینا ناتھ مدن۔ چوتھا ایڈیشن۔ 1921ء۔ (14)شریمد بھگوت گیتا۔از سروانند کول پریمی۔1992ء۔ (15)شریمد بھگوت گیتا مع گیتا بودھ۔ از مہاتما گاندھی۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔ 1991ء۔ (16)شریمد بھگوت گیتا اردو۔ از ہری رام بھارگو منشی نول کشور لکھنؤ۔(17)شریمد بھگوت گیتا منظوم ترجمہ از خواجہ دل محمد۔خواجہ بلک ڈپو۔موہن لال روڈ لاہور۔1944۔یہ ترجمہ دل کی گیتا کے نام سے بھی مشہور ہے۔اس کا جدید ایڈیشن 2004ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ (18) نغمۂ روحانی ایشوریہ گیان یعنی شریمد بھگوت گیتا۔ پریمی جی۔موہن لال مالک چاند بک ڈپو دہلی۔(19)شریمد بھگوت گیتا مع اردو ترجمہ۔از سر گیاشی بابو بھگوان داس بھارگو پٹنہ۔ نامی گرامی منشی نول کشور لکھنؤ۔ 1945ء۔ (20) کلام ربانی از یوگی راجہ نظر سوہانوی۔ چندر گیت پریس دہلی 1934ء۔(21)اوم شریمد بھگوت گیتا (فارسی منظوم کا اردو ترجمہ) از درگا داس جی شرما۔ سودلیتھو پریس پٹودی ہاوس دہلی۔(22) مہا گیتا از منشی سوامی دیال۔ دیال پرنٹنگ پریس ہوشیار پور پنجاب۔ 1867ء۔ (23)اردو شاعری میں گیتا(نغمۂ علم وعمل)از انور جلال پوری مشہور شاعر و مایہ ناز خطیب و ناظم مشاعرہ۔نعمانی پرنٹنگ پریس لکھنؤ2013۔)24)صدر کی گیتا موسومہ بھگوت گیتا ئے منظوم از منشی لچھمن پرشاد۔ آدرش کتاب گھر دہلی 1910۔ (25) گیتا امرت عرف بھگوان کا گیت۔ از ست پال بھاردواج عارف۔1976ء۔(26) گیتا پروجن۔از ونوبا اردو ترجمہ از خواجہ زکریا فیاض ایڈوکیٹ بجنور۔دکن لاء رپورٹس پریس جام باغ حیدرآباد دکن۔ 1957ء۔(27)بھاگ ودیا از بھگوان ویاس اردو ترجمہ سید رضی حسن انگریزی ترجمہ ایس رادھا کرشنن۔(28)شریمد بھگوت گیتا المعروف سرل گیتا ترجمہ از سان پرمارتھی ایڈیٹر مارتنڈ و مترجم مہابھارت مارتنڈ پتکالیہ۔سبزی منڈی دہلی۔(29) گیا اُردو منظوم از۔مولانا سید حبیب لاوری ایڈیٹر سیاست، لاہور، 1944ء۔ (30)نغمۂ توحید یعنی شریمد بھگوت گیتا منظوم۔ برکت رائے گپتا۔نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد۔1982 اس ترجمہ میں ابتدائی مضمون ڈاکٹر حسن الدین احمد کا تحریر کردہ ہے۔ (31)من کی گیتا یعنی بھگوت گیتا کا نثری ترجمہ۔ از موہن لال چھاپڑہ۔ وجیا آفیسٹ پرنٹرس نئی دہلی 1988ء۔ (32) بھگوت گیتا از۔ڈاکٹر شان الحق حقی (اردو منظوم ترجمہ) انجمن ترقی اردو ہند۔نئی دہلی۔1994ء۔

مندرجہ بالا اردو تراجم جو بھگوت گیتا کے ہیں یہ کافی مشہور و معروف ہیں۔ان تراجم میں منظوم تراجم بھی شامل ہیں

www.urduacademyts.com

اور منشور تراجم بھی شامل ہیں۔ مندرجہ بالا بھگوت گیتا کے اردو تراجم کی اس چھوٹی سے فہرست سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اکثر مترجمین ہندو پنڈت ہیں جنہوں نے بھگوت گیتا کا اردو میں عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض پنڈت حضرات اردو اور فارسی کے پختہ گو شاعر بھی تھے۔ یہ یقیناً اردو تہذیب کی خوبصورت مثال ہے۔ ان کے علاوہ بھی اردو میں بھگوت گیتا کے دوسرے تراجم ملتے ہیں۔ بھگوت گیتا کے ان اردو تراجم کی فہرست میان ایک اہم اردو ترجمہ ''شریمد بھگوت گیتا گیتا'' (از ڈاکٹر حسن الدین احمد) بھی ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ڈاکٹر حسن الدین احمد کا مختصر تعارف پیش کیا جائے تا کہ ان کی شخصیت کے متعلق ضروری باتیں سامنے آجائیں۔ پھر اس کے بعد اردو ترجمہ شریمد بھگوت گیتا پر روشن ڈالی جائے گی۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد ریاستِ حیدرآباد اور حکومتِ ہند دونوں کی سول سروس میں برسرِ خدمت رہے۔ چنانچہ وہ ہندوستان کے مرکزی وقف کونسل کے رکن، غیر منقسم آندھرا پردیش میں وقف بورڈ کے صدر نشین اور ہندوستان کے قومی اقلیتی کمیشن کے صدر نشین رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد حیدرآباد دکن کے ایک نامور سپوت تھے۔ نوائط خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ 12 فروری 1923ء کو ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کے دادا نواب عزیز جنگ ولاؔ حیدرآبادی تھے جو عربی، فارسی اور اردو کے ایک بڑے شاعر و ادیب اور محقق تھے۔ شاعری، نثر نگاری، تاریخ نگاری، قطعہ گوئی اور انتظامی امور میں انہیں اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں قدرت نے عطا کی تھیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں ان کا اہم کارنامہ آصف اللغات کی ترتیب ہے۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد کے والد نواب دین یار جنگ تھے جو ریاست حیدرآباد کے ایک اعلیٰ عہدیدار اور نواب تھے۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد کو بنیادی طور پر الہیات، اسلامیات، ادبیات، بین مذہبی مذاکرات اور سماجی و تعلیمی موضوعات، ترجمہ نگاری اور تراجم پر تحقیق کے سلسلہ میں عبور حاصل تھا۔ دو درجن سے زائد ان کی کتابیں انہیں موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں انگریزی شاعری کے گیارہ سو منظوم اردو ترجموں کا مجموعہ (1976ء) سازِ مشرق ساز مغرب (عربی و فارسی شاعری اور سنسکرت اور برصغیر کی علاقہ واری شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا انتخاب) اور انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیق و تنقیدی و تنقیدی مطالعہ (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی مطبوعہ 1984) وغیرہ نہایت اہم ہیں۔ ماضی قریب میں یعنی 13/اگست 2019ء کو ڈاکٹر حسن الدین احمد کا انتقال ہوا۔ ان کی علمی و ادبی وقیع خدمات پر 2003ء میں انہیں مخدوم ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ڈاکٹر حسن الدین احمد کو الہیات، اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ میں خصوصی دل چسپی تھی۔ ان موضوعات میں ان کا گہرا مطالعہ تھا اسی لئے انہوں نے قرآن مجید سے متعلق انگریزی اور

www.urduacademyts.com

اردو میں مختلف کتابیں لکھیں۔ انہوں نے نغمۂ الوہیت یعنی بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ ''شریمد بھگوت گیتا'' کے نام سے کیا۔ اس ترجمہ کا پہلا ایڈیشن 1975ء میں، دوسرا ایڈیشن 1983ء میں اور تیسرا ایڈیشن 1997ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے شائع ہوا۔ پہلے یہ کتاب اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا مقدمہ پنڈت سندر لال نے تحریر کیا ہے۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد نے جب پہلے پہل 1947ء میں بھگوت گیتا کا مطالعہ شروع کیا تو اس وقت ان کو مایوسی ہوئی تھی۔ انہیں کوئی ایسا ترجمہ دستیاب نہ ہوسکا جس کے مطالعہ سے بآسانی مطالب کی تفہیم ہوتی لیکن ابتداء ابتداء میں انہیں بھگوت گیتا کے تراجم کا بھرپور اندازہ نہ تھا چنانچہ انہوں نے مرزا برکت رائے کے ترجمہ ''نغمۂ توحید یعنی شریمد بھگوت گیتا منظوم'' میں شامل اپنے مضمون ''ابتدائی باتیں'' میں واضح طور پر لکھا کہ پہلے انہیں بھگوت گیتا کے اردو میں تراجم کی کثرت کا علم نہیں تھا چنانچہ وہ یوں رقم طراز ہیں:

''بھگوت گیتا سے میری دل چسپی ایک ثلث صدی سے ہے۔ میں نے جب 1945ء میں جبکہ میری عمر 13 رسال تھی، شریمد بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ کرنے کا خیال کیا تو میں نے موجود اردو ترجمے فراہم کئے۔ مجھے اس وقت اردو ترجموں کی کثرت کا علم نہ تھا۔ دو تین ترجمے جو مجھے مل سکے ان میں رانی برکت رائے کا منظوم ترجمہ بھی شامل تھا۔ میں نے اس کا نہایت دل چسپی سے مطالعہ کیا (اور آگے لکھا ہے کہ) اس بات کو گیتا والے بھی کم جانتے ہیں اور اردو والے بھی کہ شریمد بھگوت گیتا کے جتنے ترجمے اردو میں ہوئے ہیں شاید ہی کسی اور زبان میں ہوئے ہیں۔ یہ بات گیتا کے پریمیوں کے لئے بھی لائقِ فخر ہے اور اہلِ اردو کے لئے بھی۔'' (نغمۂ توحید، ص13)

گیتا کے تراجم کی کثرت کے باوجود ڈاکٹر حسن الدین احمد نے ''شریمد بھگوت گیتا'' کا اردو ترجمہ کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھا:

''باوجود تلاش و جستجو کے مجھے کسی ایسے اردو ترجمہ کے حصول میں کامیابی نہیں ہوئی جو میری اور مجھ جیسے دوسرے بے شمار اردو دانوں کی تشفی کا باعث ہوتا۔ اس کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کر کے میں نے 1945ء میں انگریزی ترجموں کی مدد سے آسان اردو میں بھگوت گیتا کا ترجمہ کیا ہے۔'' (شریمد بھگوت گیتا، ص10)

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ گیتا کے مطالب و مفاہیم کی آسانی اور اردو دانوں کی تشفی کے لئے ڈاکٹر حسن الدین احمد نے یہ ترجمہ کیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ترجمہ آسان اردو زبان میں کیا ہے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد کے اس ترجمہ سے مثالوں کے پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ گیتا کے جو ابواب انہوں نے متعین کئے ہیں، انہیں درج کیا جائے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے اس میں جملہ

www.urduacademyts.com

18/ابواب قائم کئے ہیں جو اس طرح ہیں:

پہلا باب: ارجن کی اداسی' دوسرا باب: علم کا فلسفہ' تیسرا باب: عمل کا فلسفہ' چوتھا باب: عرفانِ عمل اور ترکِ دنیا کا فلسفہ' پانچواں باب: اعمال کے نتیجہ سے دستبردار ہونے کا فلسفہ' چھٹا باب: خود پر پانے کا فلسفہ' ساتواں باب: علم وعرفان کا فلسفہ' آٹھواں باب: لافانی برہم کا فلسفہ' نواں باب: اعلیٰ ترین علم اور اعلیٰ ترین راز کا فلسفہ' دسواں باب: خدا کی عظمت کا فلسفہ' گیارھواں باب: ہمہ از وست کا فلسفہ' بارھواں باب: عقیدت کا فلسفہ' تیرھواں باب: مادہ اور روح کے فرق کا فلسفہ' چودھواں باب: تین خاصیتوں کی تقسیم کا فلسفہ' پندرھواں باب: اعلیٰ ترین روح کے حصول کا فلسفہ' سولہواں باب: رحمانی اور شیطانی قوتوں کی تقسیم کا فلسفہ' سترھواں باب: عقیدت کا تین اقسام کا فلسفہ اور اٹھارھواں باب: نکی اور ترکِ علائق کا فلسفہ۔

اٹھارھویں باب کے اختتام کے بعد یعنی آخر آخر میں ڈاکٹر حسن الدین احمد نے سنسکرت الفاظ اور اصطلاحات کو تشریح کے ساتھ لکھا ہے اور وہ نام جو بھگوت گیتا میں استعمال ہوئے ہیں ان کی مختصر جامع تشریح بھی لکھی ہے اور ایک شجرہ اور مہابھارت کی جنگ کے نقشہ کو بھی شامل کر دیا ہے۔ اس طرح یہ آخری حصہ بھی اہم ہے۔ اس سے خاص طور پر اس مقدس کتاب کے نئے پڑھنے والوں کے لئے زیادہ فائدہ ہوگا۔ یہ آخری حصہ گویا گیتا کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے کافی محنت، عرق ریزی اور جاں فشانی سے کیا ہے اسی لئے مقدمہ میں پنڈت سندر لال نے بجا طور پر یہ لکھا کہ:

''ڈاکٹر حسن الدین احمد کے ترجمہ کی اپنی جگہ اور اپنی خاص اہمیت ہے۔ اردو پڑھنے والوں کو خاص کر مذہبی چھان بین کی خواہش رکھنے والوں اور ان لوگوں کو جو اس ملک کے رہنے والوں میں ایک دوسرے کی ٹھیک جان کاری، محبت اور میل ملاپ کو پڑھتے دیکھنا چاہتے ہیں، ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب کا بے حد احسان مند ہونا چاہئے اور شکر گزار ہونا چاہئے۔ ملک اور مذہب دونوں کی یہ سچی خدمت ہے۔''
(شریمد بھگوت گیتا ص 7-8)

یہ بات یقیناً درست لگتی ہے کہ آج کے نفرت زدہ ماحول میں ایسے تراجم اور ایسی کوششوں سے باہمی ربط وارتباط بڑھتا ہے اور مختلف مذاہب والوں کے درمیان امن وآشتی کی فضا قائم ہوتی ہے اور اس سے مختلف قوموں کے درمیان میل ملاپ بڑھتا ہے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے ترجمہ کے اس کام کی نزاکت کے پیش نظر بھگوت گیتا کے اردو ترجمہ سے فراغت کے بعد سنسکرت اور اردو زبان کے ماہر جناب آوبندر شرما صاحب (صدر شعبۂ سنسکرت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) کو نظر ثانی کے لئے دکھایا۔ انہوں نے اس ترجمہ کو لفظاً لفظاً پڑھ کر اس سے متعلق مفید مشورے اور ہدایات دیں۔ اس کے بعد یہ معرکہ سرانجام پایا۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد نے سنسکرت زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بھگوت گیتا کے انگریزی اور اردو تراجم سے استفادہ کر کے یہ ترجمہ پورا کیا اور انگریزی میں مس اینی بیسینٹ (MISS ANNIE

www.urduacademyts.com

(EDWIN اور ایڈون آرنلڈ BESANT)
(ARNOLD) کے تراجم سے خصوصاً استفادہ کیا جن سے ان کو گیتا کے مطالب کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔

بھگوت گیتا کے ترجمہ میں ڈاکٹر حسن الدین احمد نے تقریباً رواں اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کا رواں اسلوبِ تحریر ملاحظہ کیجئے:

''خاندان کو تباہ کرنے والوں کی ذات میں اختلاط پیدا کرنے والے خراب اعمال سے ذات کی مخصوص رسوم اور خاندانی روایات مٹ جاتی ہیں۔ اے جناردن! اور ہم یہ سنتے آئے ہیں کہ جس نے خاندانی روایات کی تباہی کی ہو ایسے آدمی کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لئے دوزخ ہوگا۔ دیکھو تو سہی ہم لوگ دانش مند ہو کر بھی حکومت کے عیش کے لالچ میں اپنوں کو مارنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ کتنے بڑے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔(45) (شریمد بھگوت گیتا،ص 22-23)۔

رواں اسلوب کو ملاحظہ کرنے کے لئے ایک اور مثال دیکھئے:

''متزلزل اور غیر مستقل دل جدھر جدھر رسائی کرتا ہے ادھر ادھر سے اس کو روک کر خود ہی کے قابو میں رکھنا چاہئے۔'' (26) شریمد بھگوت گیتا،ص 49)

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہے کہ مطالب کی تفہیم میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ یہ کافی رواں دواں اسلوب ہے۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد چوں کہ بنیادی طور پر اردو ادیب تھے۔ اس اعتبار سے ان کا ترجمہ شریمد بھگوت گیتا میں تخلیقی ترجمہ کی شان پائی جاتی ہے اور محاوروں کا بہترین استعمال ملتا ہے اور اس ترجمہ میں ادبی زبان کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔

اس تناظر میں درج ذیل اقتباس خصوصاً ملاحظہ کیجئے:

''اے کرشن! ان رشتہ داروں کو دیکھ کر جو جنگ کی خواہش سے یہاں جمع ہوئے ہیں، میرے اعضاء شل ہو رہے ہیں، میرا منہ خشک ہو رہا ہے۔ میرا جسم لرز رہا ہے اور میرے رونگھٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ گانڈیو (کمان) میرے ہاتھ سے گرنے کو ہے، میرے بدن میں آگ سی لگ رہی ہے، مجھ سے کھڑا نہیں رہا جاتا اور میرا دماغ چکرا رہا ہے (28 تا30) (شریمد بھگوت گیتا،ص 21)

اس اقتباس میں خصوصیت کے ساتھ اعضاء شل ہونا، منہ خشک ہونا، جسم لرزنا، رونگھٹے کھڑے ہونا، بدن میں آگ لگنا اور دماغ چکرانا وغیرہ۔ اردو افعال اور محاورے ہیں جن کے استعمال سے ڈاکٹر حسن الدین احمد کی ادیبانہ قابلیت، زبان پر دسترس اور ترجمہ پر عبور کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ اردو ترجمہ ایسی متعدد خصوصیات سے مزین ہے۔ اس لئے بھگوت گیتا کے سارے اردو تراجم میں رواں اسلوب اور عام فہم ہونے کے لحاظ سے یہ ترجمہ سب سے ممتاز اور نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

☆☆☆

کے رحمت اللہ
پی ایچ۔ ڈی اسکالر، شعبۂ ترجمہ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔32
موبائل: 9154562187

www.urduacademyts.com

ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز بحیثیت صحافی

سید فاضل حسین پرویز نے اگرچہ کہ اپنے صحافتی کریئر کا باقاعدہ آغاز 1980ء میں روزنامہ رہنمائے دکن کے اسپورٹس جرنلسٹ کی حیثیت سے کیا ہے مگر وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے جب انہوں نے ضلع پریشد ہائی اسکول جوگی پیٹ کے قلمی میگزین ''مانجیرا'' کے ایڈیٹر بنے اور تبھی سے رہنمائے دکن کے علاوہ ادبی ماہنامہ ''سوبرس: دہلی''، ہفتہ وار ''نئی دنیا'' میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کئے۔ تقریباً پانچ سال تک وہ ایک کہانی کار اور افسانہ نگار کے طور پر وہ نوجوانوں میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب رہے اور تقریباً 32 افسانے لکھے جو رہنمائے دکن، ماہنامہ نور: رام پور، خاتون مشرق، گلابی کرن، فلمی ستارے میں شائع ہوئے۔ اسپورٹس جرنلسٹ کی حیثیت سے انہوں نے نہ صرف رہنمائے دکن کے ہفتہ وار کالم مسلسل 20 سال تک لکھے بلکہ اس دوران کئی شہرہ آفاق کھلاڑیوں کے انٹرویوز لئے جو نمایاں طور پر رہنمائے دکن، نئی دنیا کے علاوہ پاکستان سے شائع ہونے والے اسپورٹس میگزین ''اخبارِ وطن'' اور دہلی سے شائع ہونے والے جریدہ ''آج کا نوجوان'' میں شائع ہوئے۔ پاکستانی کرکٹرز جاوید میانداد، رمیض راجا، اقبال قاسم، مشتاق احمد ہندوستان کے تقریباً سبھی نامور کھلاڑیوں گواسکر، کپل دیو، وینکسر کر، یشپال شرما، مدن لال، رامن لامبا، سریکانت، جی وشوانا تھ، مندر سنگھ، ارشد ایوب، شیولال یادو، ایم ایل جے سمہا وغیرہ سے انٹرویوز بھی لئے اور ان پر خصوصی مضامین بھی شائع کئے۔ مختلف ممالک کے کرکٹرز برین لارا، ویون ریچرڈس، رچی رچرڈسن، ناصر حسین، ہندو پاک کے ہاکی کھلاڑی ظفر اقبال، محمد شاہد، جلال الدین، ایوب، حسن سردار، اولیس، بیاڈمنٹن کھلاڑیوں سید مودی مرحوم، پرکاش پڈوکون، ٹینس کھلاڑیوں ثانیہ مرزا، عظمیٰ خان کے علاوہ مختلف اسپورٹس مین سے انٹرویوز لئے اور مضامین لکھے جن میں اپنے دور کے مشہور پہلوان اور فلمی اداکار دارا سنگھ شامل ہیں۔

فاضل حسین پرویز کو اصل شہرت اظہر الدین سے متعلق پیشن گوئیوں اور ان پر لکھی گئی کتاب ''اظہر الدین: کرکٹ کا شہزادہ'' سے ملی۔ رہنمائے دکن میں ابھرتے کرکٹرز کے تعارفی سلسلہ نے ایک نئی ہلچل پیدا کردی تھی کیونکہ اردو صحافت میں ایسی کوئی روایت نہیں تھی۔ اسپورٹس جرنلسٹ کے ساتھ ساتھ انہیں رہنمائے دکن میں بزنس اور مارکیٹنگ کا شعبہ بھی تفویض کیا گیا تھا اور فاضل حسین پرویز جنہوں نے باقاعدہ جرنل ازم کی ڈگری حاصل کی تھی، اس شعبہ میں ایک نئی سمت پیدا کی اور رہنمائے دکن کو کارپوریٹ سیکٹر سے متعارف کروایا۔ ہر بڑی قومی اور بین الاقوامی کمپنی کا تعارف اور ان کے مالکین یا ڈائرکٹرز کے انٹرویوز شائع کئے۔ چاہے وہ Mitsubishi جاپانی مینجنگ ڈائرکٹر ہو یا ماروتی کار ہو یا یاماہا ٹو وہیلر، ایل ایم ایل اسکوٹر ہو یا کوئی سولار پاور کی کمپنی۔

مضامین

www.urduacademyts.com

ٹکسٹائیل انڈسٹری سے لے کر پولٹری انڈسٹری تک۔ ریئل اسٹیٹ سے لے کر انجینئرنگ ڈویژن تک۔ رہنمائے دکن کی ایک نئی پہچان بن گئی۔ 1990ء کی دہائی کارپوریٹ سیکٹر اور شیئر مارکٹ کی دہائی تھی۔ حیدرآباد میں ہر روز اوسطاً پانچ بڑی کمپنیوں کے شیئرز کو متعارف کروانے کے لئے فائیو اسٹار ہوٹلس میں پریس کانفرنس کا اہتمام کیا جاتا تھا جس میں رہنمائے دکن کے لئے فاضل حسین پرویز خصوصی انٹرویو لیا کرتے تھے' جو دوسرے اخبارات میں شائع نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ ایک پریس کانفرنس کے دوران جسے ڈاکٹر فاروق عبداللہ چیف منسٹر جموں وکشمیر اور رتن ٹاٹا نے مشترکہ طور پر خطاب کیا تھا' فاضل حسین پرویز نے ان دونوں شخصیات سے انٹرویو لئے اور ساتھ ہی رہنمائے دکن کے لئے ان سے اشتہارات منظور کروائے۔ فاروق عبداللہ نے جموں وکشمیر کے محکمہ سیاحت کا اشتہار جاری کروایا اور رتن ٹاٹا کی ہدایت پر ٹاٹا موبائیل کا پہلا رنگین اشتہار حیدرآباد میں کسی اردو اخبار کو جاری ہوا تو وہ رہنمائے دکن تھا۔ اسپورٹس' بزنس کے ساتھ ساتھ رہنمائے دکن کے خصوصی ایڈیشنس کی اشاعت سے ایک اور پہچان بن گئی' حیدرآباد کے مختلف محلوں کی تاریخ' وہاں کی عمارتوں کا پس منظر' وہاں کی مشہور شخصیات کے تعارفی سلسلہ نے رہنمائے دکن اور فاضل حسین پرویز دونوں کو زبردست شہرت عطا کی۔ رہنمائے دکن کے یہ خصوصی ایڈیشن آج بھی کئی کتب خانوں کے علاوہ باذوق حضرات کے پاس دستاویز کے طور پر محفوظ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایکسپورٹس' پولٹری' شیپ فارمنگ' جیولری' ہیرے جواہرات پر مبنی موضوعات پر بھی یادگار ایڈیشن شائع کئے۔ پہلی مرتبہ اردو قارئین کو سمجھایا گیا کہ شیئرز کیا ہوتے ہیں۔ شیئرز اور موچول فنڈ میں کیا فرق ہوتا ہے۔ انشورنس کی کیا اہمیت ہے۔ ریئل اسٹیٹ پر نکالا گیا خصوصی ایڈیشن اب بھی کئی بلڈرس' آرکیٹکٹس اور انجینئرس کے پاس محفوظ ہے جس میں حیدرآباد کے نامور مسلم بلڈرس' انجینئرس' آرکیٹکٹس کے انٹرویوز شامل کئے گئے تھے جس میں فلیٹ سسٹم کی اہمیت بتائی گئی۔ اس کے اصول اور قواعد سے واقف کروایا گیا۔ طب وصحت پر کئی خصوصی شمارے شائع کئے گئے' ان میں 'مسلم شفاخانے نمبر' دستاویزی اہمیت کا حامل ہے جس میں ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمیدؒ اصلاحی دواخانے کے مالک کے علاوہ حیدرآباد کے بزرگ ممتاز اطباء کرام اور ڈاکٹرس' ہاسپٹلس کا مکمل تعارف شائع کیا گیا تھا۔ اسی طرح عالمی یوم صحت کے موقع پر کئی سال تک ہیلتھ اسپیشل قارئین کی رہنمائی کے لئے شائع ہوتا رہا۔ تعلیمی اداروں اور ماہرین تعلیم کی خدمات پر رہنمائے دکن کا 32 صفحات پر مشتمل خصوصی ایڈیشن اپنی مثال آپ تھا جس میں لگ بھگ ڈیڑھ سو مضامین شامل تھے۔ اسی طرح دہلی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''نئی دنیا'' کے لئے ایک ضخیم ''حیدرآبادی مسلمان نمبر'' مرتب کیا جس میں ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں سے متعلق تحقیقی مضامین شامل ہیں۔

اکٹوبر 1999ء سے انہوں نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''گواہ'' کی اشاعت شروع کی اور حال ہی میں میڈیا پلس کی

www.urduacademyts.com

بنیاد ڈالی۔

میڈیا پلس اپنی نوعیت کا ہندوستان بھر میں مسلم انتظامیہ کے تحت منفرد ادارہ ہے جس میں ایک چھت کے نیچے ہر قسم کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ مختلف اداروں اور شخصیات کے لئے تعلقات عامہ (پبلک ریلیشنس)، اشتہارات کی تیاری اور اجرائی، اس کے ساتھ مختلف تقاریب بالخصوص پریس کانفرنس، سمینار، ادبی تقاریب کے لئے دو ایئر کنڈیشنڈ آڈیٹوریم فراہم کئے گئے ہیں۔ میڈیا پلس آڈیٹوریم اس وقت حیدرآباد میں تہذیبی، ثقافتی، ادبی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس ادارہ کے تحت روزگار کے مواقع بھی فراہم کئے گئے، اس طرح حیدرآباد میں گزشتہ 50 برس کے دوران کسی ورکنگ جرنلسٹ کی جانب سے قائم کردہ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے ابھرتے صحافیوں کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کئے۔

فاضل حسین پرویز نے کئی قومی اور بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیات سے ملاقات کی، انٹرویوز لئے جن میں صدور جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام، پرنب مکرجی، وزراء اعظم راجیو گاندھی، اندر کمار گجرال، وی پی سنگھ، دیوے گوڑا، منموہن سنگھ، مرکزی وزراء اور مختلف ریاستوں کے چیف منسٹرس، مذہبی شخصیات، روحانی پیشواء جن میں فاروق عبداللہ، مولوی محمد فاروق شہید، میر واعظ، عمر فاروق، مفتی محمد سعید، محبوبہ مفتی، سیف الدین سوز، شیلا ڈکشٹ، این ٹی راماراؤ، ڈاکٹر چنا ریڈی، چندرابابو نائیڈو، وائس ایس راج شیکھر ریڈی، کرن کمار ریڈی، کے روشیا، کے چندر شیکھر راؤ، مختلف ممالک کے سفراء سے بھی ملاقاتیں کیں۔ مذہبی رہنماؤں میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، ڈاکٹر اسرار احمد، فلسطین کے مفتی اعظم علامہ عکرمہ صابری، ڈاکٹر سیدنا برہان الدین، شہزادہ مفضل بھائی صاحب (موجودہ روحانی پیشوا)، پرنس کریم آغا خان (فرقہ اسماعیلیہ کے روحانی پیشوا) کے علاوہ امام احمد رضا خان صاحبؒ کے خانوادہ کے چشم و چراغ مولانا توقیر رضا خان، مولانا ارشد مدنی، مولانا محمود مدنی، ڈاکٹر عبدالکریم پاریکھ، مولانا ولی رحمانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مسلمانوں کے مختلف فرقوں جن میں شیعہ، مہدوی، اسماعیلیہ، میمن، بوہرا وغیرہ پر تحقیقاتی مقالے لکھے جو رہنمائے دکن کے علاوہ ''گواہ'' میں شائع ہوئے۔

انہوں نے ختم نبوت کی تحریک شروع کرنے والے مجلس احرار (لدھیانہ) کی 75 سالہ یوم تاسیس کے موقع پر ''گواہ'' کا سولہ صفحات پر مشتمل ''ردِ قادیانیت نمبر'' شائع کیا جس پر قادیانیوں نے قانونی کاروائی کی دھمکی دی تھی۔ 2001ء میں حیدرآباد کے ایک نالائق ونکمے گمراہ نوجوان نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تو مختلف دینی درسگاہوں سے فتاوے لے کر اس کے خلاف تحریک چلائی۔ 2022ء میں حیدرآباد کے لئے گمراہ طبقہ کے شاعر سروش نے ام المومنین سیدہ عائشہ اور خلفائے ثلاثہ کی شان میں گستاخانہ اشعار لکھے، تو اس کے خلاف گواہ میں مذمتی مضمون لکھا اور مسلم سماج سے اس کے بائیکاٹ کی اپیل کی۔ اس مضمون کی بنیاد پر اس ملعون شاعر کو ہندوستان کے کسی بھی مشاعرہ میں شرکت کی دعوت

مضامین

www.urduacademyts.com

نہیں دی جائے گی حتیٰ کہ نظام کی سالگرہ کے موقع پر ویمنس کالج کوٹھی میں منعقدہ مشاعرہ سے بھی اس کا نام نکال دیا گیا۔

فاضل حسین پرویز نے اپنے قلم اور اپنے اخبار کو ملت کی امانت سمجھتے ہوئے اس بات کی کوشش کی کہ اس کا صحیح استعمال ہو، اس کے ذریعہ ملی انتشار ختم ہو اور اتحاد کی راہیں ہموار ہوں۔ چنانچہ مجلس اتحاد المسلمین اور مجلس تعمیر ملت کے اختلافات کو ختم کرنے کے لئے ان کی تحریر ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے جو گواہ کے میلاد النبی نمبر 2000ء میں شائع ہوئی۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ 2001ء میں برسوں کے اختلافات ختم ہوئے اور مسلمانوں کی سیاسی اور ثقافتی تنظیمیں ایک ہوگئیں۔

یوم عاشورہ کے موقع پر ''حیدرآباد کا محرم'' کے عنوان پر شیعہ سنی اتحاد کے لئے گواہ کا ایسا ایڈیشن شائع کیا گیا جس کے ذریعہ پہلی بار سنی مسلمانوں کی اکثریت کو بہت ساری باتوں کا پہلی بار علم ہوا، جیسے اثنائے عشری یا بارہ امام، بی بی کا علم کا تاریخی پس منظر، نعل صاحب کا علم، عاشورخانے، ذاکرین، مجتہدین، نوحہ خوان، مرثیہ نگار و مرثیہ خوان کے تعارف ان کی تصاویر کے ساتھ شائع کئے گئے۔ حیدرآباد کی تاریخ میں یہ پہلی بار کسی سنی صحافی نے لکھا اور شائع کیا ہے۔

صحافتی کریئر کے دوران ہزاروں مضامین مختلف موضوعات پر لکھے، 5 کتابیں 'اظہر الدین: کرکٹ کا شہزادہ' کرکٹ: ریکارڈ اینڈ ریفرنس، یادوں کا کاروان، حکیم جی اے قادری کی سوانح عمری، اردو میڈیا: کل آج کل (دو ایڈیشن)' سچ تو مگر کہنے دو، سچ ہی تو ہے شائع ہوچکی ہیں اور کڑوا سچ زیر طبع ہے۔ مختلف جرائد کے علاوہ صحافت سے متعلق تحقیقی مقالوں اور کتابوں میں فاضل حسین پرویز سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ روزنامہ ''ہندو'' کے سابق اسٹاف رپورٹر جے ایس افتخار نے اپنی انگریزی تصنیف Gems of Deccan میں قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک کے 51 منتخب شعراء، ادباء، دانشوروں کے سوانحی خاکے لکھے ہیں۔ ان میں ایک واحد صحافی فاضل حسین پرویز ہیں جنہیں جے ایس افتخار نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی ادبی صحافت کو سراہا۔

اردو میڈیا: کل آج کل، تین یونیورسٹیز کے نصاب میں شامل ہے۔ ملک کے مختلف مقامات پر سمینارس میں شرکت اور مقالے پڑھنے اور ٹی وی چینلس پر مباحث میں شرکت کا اعزاز حاصل ہے۔

سعودی عرب، ایران، عراق، اردن، انگلینڈ اور امریکہ کا وہاں کی حکومتوں کی دعوت پر دورہ کرچکے ہیں۔

وقت کی رفتار سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرتے ہوئے گواہ یوٹیوب چینل بھی شروع کیا گیا ہے جو آہستہ آہستہ اپنی پہچان بنا رہا ہے۔

ڈاکٹر فاضل حسین پرویز کو ان کے ادارتی مضامین ''سچ تو مگر کہنے دو'' سے ایک مقام ملا۔ ممتاز ادیب، شاعر، نقاد پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے فاضل حسین پرویز کے فن اداریہ نگاری پر باقاعدہ ایک تحقیقی مضمون لکھا جس میں وہ لکھتے ہیں:

www.urduacademyts.com

''ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز ذہنی بیداری سے کام لے کر عادت، علت اور Reflex کو راہ دیتے ہیں۔ اخلاقی و معاشرتی اتھل پتھل کو احتجاجی انداز کے پیمانے پر رکھتے، جانچتے اور پرکھتے ہیں اور سچائی کو بنیادی قدر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس طرح جامع عکس سامنے آتا ہے۔ اور وارادتوں کی نئی تاریخ ترتیب پاتی ہے''۔

سید فاضل حسین پرویز ''گواہ'' کے مدیر ہیں۔ اسلوب اور تحریر کے عمل میں آزاد ہیں۔ Transitive Verse کی وجہ سے ان کی تحریر مقصدی ہوتی ہے وہ عوامی ابلاغ چاہتے ہیں اسی لئے حقیقی واقعات کی عکاسی کرتے وقت عصبیت اور جانب داری کے عناصر سے اپنے علم کو دور رکھتے ہیں۔

فاضل حسین پرویز کی فائقی تحریروں کا تعلق معنویت اور اونچی سطح کے تمثالی اور بصیرت و پُرکیفی سے ہے۔ ان میں معاشرتی، شناسائی اور ثقافتی کوڈز کی وجہ سے صاحب اقتدار لوگوں کی بعض زیادتیوں کے واقعات، دہشت گردوں اور سامنا سے متعلق باتیں، جنس اور بعض فطری و غیر فطری فعل کے بارے میں اور دیگر مسائل کا کھلے الفاظ میں ذکر ہوتا ہے جس کے سچ کا surrogate زماں و مکاں کے وجود کا احاطہ کرتا ہے۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کمیونیکیشن لکھنے والے پر مرکوز ہوتا ہے۔ سید فاضل حسین پرویز کے اداریہ کی زبان جہاں سیاسی اور اقتصادی ہوتی ہے وہی عقیدتی اور روزمرہ کی ضرورتوں کی بھی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ڈسکورس آگہی میں اضافہ کرتی ہے جس کے Evaluation کا میدان عمل وسیع تر ہوتا ہے۔ عصری تقاضے کے مطابق ہوتا ہے اور رائج الوقت مروجہ نظام کی طرح ہوتا ہے۔ ان کی آزادانہ سوچ میں اطلاع بہم پہنچانے کے عوامل ہوتے ہیں جس کے روپ الگ الگ ہیں۔ متکلم کی وحدت پر ضرب لگاتے وقت ان کی تحریر Pluralism اور Relativity کے تابع ہوتی ہے۔

فاضل حسین پرویز کے اداریہ کی یہ بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ ایک واقعہ سے کئی مطلب نکالتے ہیں اور معنی کی کئی سطحوں سے موج تہہ نشین تک پہنچتے ہیں، اسی اداریہ ہجومی تشدد پر روشنی ڈالتے ہوئے ظاہری رنگ کے ساتھ اندرونی کسک کو بھی بیان کرتے ہیں اور قابل ذکر نکتے کو پیش کرتے ہیں۔

فاضل حسین پرویز کی تہہ نشین تحریر کی معنویت میں جگنوئی چمک ہے۔ خودترقی، انفعالیت اور خودترحمی میں شدت احساس ہے۔ منفی حالات سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب ہے اور حالات کے جبر کا ردعمل ہے۔

☆☆☆

آمنہ مقبول، ریسرچ اسکالر تلنگانہ یونیورسٹی
9-17-160، ہاشمی کالونی، نزد چشتیہ مسجد
، نظام آباد۔ 503001، تلنگانہ۔
Cell: 9948185717

رباعی

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا
اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی بدایونی

www.urduacademyts.com

ماحول کی آلودگی اور اس کا تحفظ: عصر حاضر کے ناگزیر مسائل

عصر حاضر میں ماحول ایک اہم سنجیدہ اور پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے چونکہ انسان تیز رفتار ترقی اور اس میں آنے والے انقلاب نے انسانی ضروریات میں بے تحاشہ اضافہ کردیا ہے۔ زندگی میں عیش و آرام حاصل کرنے میں اس نے اپنے ماحول کو آلودہ کردیا ہے۔ انسان قدرتی وسائل کی قلت کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے۔ آبادی میں بے تحاشہ اضافہ جنگلات کا کٹاؤ بڑھتی ہوئی آلودگی کے سبب قحط سالی، سیلاب، زلزلے، سونامی، زمین کا کھسکنا، بادل کا پھٹنا وغیرہ حادثات سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس سے پوری دنیا میں حیاتیات اور ماحول کا توازن بگڑتا جارہا ہے۔ زمین کا درجہ حرارت بڑھتا جارہا ہے، مٹی اپنی ذرخیزیت کھوتی جارہی ہے، ہوائیں لطیف سے کثیف ہوتی جارہی ہیں، دریا اور سمندر آلودہ ہوتے جارہے ہیں، نباتات وحیوانات سب غیر پائیدار ہوتے جارہے ہیں۔

ان تمام خطرات سے نمٹنے کے لیے سماج اور طالب علموں میں ماحولیاتی بیداری کے لیے انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری کا احساس بے حد ضروری ہے۔ ماحول کی خرابی اکثر اپنے اطراف کی فطری اشیاء کی تخریب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آج انہی فطری ذرائع کی حفاظت کے متعلق ہر طرف شور برپا ہے۔

اس طرح کی بیداری اور سوچ وفکر کو صرف ماحولیاتی تعلیم کے ذریعے ہی فروغ دیا جاسکتا ہے۔ لہذا مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں محققین نے یہ محسوس کیا کہ اس تناظر میں تحقیق کی اہمیت ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک ماحولیاتی مسائل سے نبرد آزما ہیں۔ لیکن ترقی پذیر ممالک کو ہر دو قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ معاشی اور ماحولیاتی۔ ماحولیاتی مسئلہ کے تین اہم پہلو ہیں۔

i ماحولیاتی آلودگی

ii ماحولیاتی آلودگی کا انحطاط کا فقدان

iii ذرائع کا فقدان

ہوائی آلودگی ساری دنیا کے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ فضا میں **CO2** کا اضافہ جو کہ رکازی ایندھن کے جلنے سے، کوئلہ، پٹرول کے جلنے سے اور کارخانوں اور گاڑیوں سے خارج شدہ دھویں کی وجہ سے ہے۔ گرین ہاؤس اثر کا باعث بنی ہوئی ہے۔ دوسرا خطرہ کلوروفلورو کاربن کا فضاء میں اضافہ کے ذریعے سے ہوا ہے۔ جو فضا کی اوزون پرت کے انحطاط کا باعث بنا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو کسی ملک کی سرحد تک محدود نہیں۔ دور حاضر کا انسان ایک **World of Crisis** میں جی رہا ہے۔ ماحولیاتی مسائل ہر فرد کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانا چاہتے ہیں۔ ایسے میں مرد وخواتین ہوں یا نوجوان ہوں ہر ایک کا یہ فرض بن گیا ہے کہ وہ ماحول کی حفاظت کریں۔ نہ صرف فرد بلکہ سماج، معاشرہ، ریاست اور ملک بھی حتیٰ کے ساری دنیا اس کے لیے کام کرے۔ ماحولیاتی مسائل سے آگاہی اور ان کا حل کرنے کی کوشش دراصل ہندوستان میں سبز انقلاب اور صنعتی انقلاب کے بعد تیسرا انقلاب ہے۔

ہندوستان میں ابتداء میں اس مسئلہ کے حل کے لیے حکومت کی مدد لی گئی۔ چونکہ ہندوستان کی آبادی میں گزشتہ کئی دہوں سے مسلسل اضافہ ہورہا ہے اس لیے ہندوستان میں ماحولیاتی مسائل کا تعلق آبادی کے اضافے کے ساتھ جڑ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے حکومت ہند کو چند سخت فیصلے لینے پڑے تھے لیکن چونکہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا تھا اس لئے حکومت نے اس مسئلہ کے حل کے لیے فلسفیانہ انداز فکر اختیار کیا کہ تعلیم کے ذریعہ افراد کی ذہنی تربیت ممکن ہے۔ تب مختلف مضامین کے ساتھ ماحولیات کے اسباق کو جوڑا گیا جہاں اسکی گنجائش نکل سکتی تھی۔ لیکن بعد میں یہ فیصلہ ہوا کہ اسے ایک مکمل علیحدہ مضمون کے طور پر مدارس میں پڑھایا جائے۔

ماحولیات ایک عالمی اصطلاح ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے تمام پہلو شامل ہے جو کہ انسانوں کے ساتھ دوسرے جانداروں کے لیے بھی ضروری ہے۔ ماحولیات **Ecology** دراصل ماحول **Environment** کے مجموعی نظام کا نام ہے۔ جس میں کائناتی نشونما طور پر فروغ پاتی ہے۔ لفظ **Ecology** کی ابتدا دو یونانی الفاظ "**Oikas**" اور "**Logos**" سے ہوئی جس سے مراد رہائشی اور مطالعہ ہے۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق ''ماحولیات حیاتیات کی وہ شاخ ہے جو اقسام اور ان کے ماحول کے درمیان باہمی تعلق کا مطالعہ کرتی ہے''۔ اس کے علاوہ انگلش ڈکشنری نے ہی ماحولیات کو مجموعی طور پر تمام عوامی تعلقات کا مطالعہ بھی قرار دیا ہے۔

www.urduacademyts.com

مختلف مفکرین نے ماحولیات کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔

Krebs کے مطابق ماحولیات اجسام کی تقسیم وکثرت کو متعین کرنے والے باہمی تعلقات کا مطالعہ ہے۔

Herr اور **Osol** کے مطابق جمہوریہ سے مراد وہ خارجی حالات ہیں جو کسی نظام حیات یا اس کے حصوں کی سرگرمیوں اور ان پر ہونے والے اثرات کا احاطہ کرتے ہیں۔

چند سائنسدانوں میں جن میں **Odum** بھی شامل ہے ''ماحولیات کو ماحولیاتی نظام کی ساخت اور کارکردگی کا مطالعہ قرار دیا ہے''۔ عام الفاظ میں ماحولیات سے مراد زندہ اجسام کے رہن سہن کے اعداد کا مطالعہ ہے یعنی ماحول کئی چیزوں سے مل کر بنتا ہے جس میں روشنی وحرارت، مٹی، پانی شامل ہیں۔ ارضی عوامل ہیں جیسے ہیں پیڑ پودے، حیوانات اور جاندار وغیرہ بھی ماحول کے ضروری عناصر ہیں اس طرح ماحول مختلف اقسام کے حیاتی اور غیر حیاتی عوامل کے آپسی اشتراک اور ان کے درمیان قائم تال میل سے بنے حالات کا نام ہے۔ سائنسدانوں کے خیال میں تمام عوامل دو بڑے درجوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔

آلودگی (Pollution):

آلودگی **(Pollution)** کا لفظ لاطینی زبان کے لفظ **"Polluere"** سے ماخوذ ہے جس کے معنی **"Soilor Defile"** گندگی یا آلودہ کے ہیں۔ اس طرح آلودگی کے معنی ''گندگی'' نجاست یا آلائش ہے۔ سائنسدانوں کے نزدیک ہوا، پانی اور مٹی میں ناپسندیدہ تبدیلی جس سے اس کے فزیکل، کیمیکل اور بائیولوجیکل کردار میں ایسی تبدیلی آئی جو جانداروں کے لیے نقصان دہ ہوں' اسے آلودگی کہتے ہیں۔ **Odum** نے آلودگی کی تعریف اس طرح کی ہے:

''ہوا، پانی اور مٹی کی طبعی، کیمیاوی اور حیاتیاتی اوصاف میں ایسی غیر ضروری تبدیلی کو جو انسانی زندگی صنعتی ترقی اور طرز رہائش اور تمدنی سرمائے کو نقصان کی حد تک متاثر کرتی ہوں' آلودگی ہے۔

آلودگی پیدا کرنے والی اشیاء:

(1) ڈپوزیٹیڈ میٹر **(Deposited Matter)** دھواں، گرد وغیرہ۔

(2) گیسز **(Gases)** آکسائڈس آف نائٹروجن، سلفر ڈائی آکسائڈ، کاربن مونو آکسائڈ اور ہیلوجنس

(3) ایسیڈس ڈراپ لیٹس **(Acid Droplets)** سلفیورک ایسڈ، نائٹرک ایسڈ وغیرہ وغیرہ۔

(4) فلورائڈس **(Fluorides)**

(5) میٹلس **(Metals)** مرکری، لیڈ، آئرن، زنک، ٹنگسٹن، کرومیم وغیرہ وغیرہ۔

(6) ایگرو کیمکلس **(Agrochemicals)** بایوسائڈس اور فرٹیلایزرس وغیرہ۔

(7) کمپلیکس آرگنک سبسٹانس **(Complex Orgainc Substances)** بنزین ایتھر اسٹک، ایسڈ نیز پائرنس وغیرہ۔

(8) فوٹو کیمیکل آکسی ڈینٹس **(Photo Chemical Oxidents)** اسموک، اوزون **Pan**، نائٹروجن آکسائڈ، الڈی بائیڈس، ایتھی لین وغیرہ۔

(9) سولڈ ویسٹس **(Solid Wastes)**

(10) ریڈیو ایکٹو واسٹس **(Radio Active Wastes)**

(11) شور شرابہ **(Noise)**

www.urduacademyts.com

آلودگی کے اقسام:

(1) فضائی آلودگی:

صاف ہوا میں گیسیس مندرجہ ذیل تناسب میں ملی ہوتی ہیں:

نائٹروجن	78.84 فیصد
آکسیجن	20.9676 فیصد
آرگن	0.934 فیصد
کاربن ڈائی آکسائڈ	0.314 فیصد
میتھین	0.0002 فیصد
ہائڈروجن	0.0005 فیصد اور دیگر گیس تھوڑی بہت۔

ہوا میں آلودگی کی وجہ خاص طور سے انڈسٹری (Industaries)، تھرمل پاور اسٹیشن، آٹو موبائل اور گھیلو ایندھن ہیں۔ فضائی آلودگی سے زمین کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ بے موسم برسات ہوتی ہے اور خطرناک سیلاب بھی آتے ہیں۔ کاربن مونو آکسائڈ کی مقدار اگر زیادہ ہوجائے تو صحت کے لئے بہت نقصاندہ ہے۔ اس سے سانس لینا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور سر میں درد وغیرہ ہونے لگتا ہے۔ فیکٹریوں کی وجہ سے تیزابی بارش کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

(2) پانی کی آلودگی (Water Pollution):

پانی کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے، پانی زندگی ہے اور ہر جاندار کی اہم ضرورت ہے۔ ضروریات زندگی کے لئے وہی پانی استعمال ہوتا ہے جو آلودگی سے پاک صاف ہو۔ پاک صاف پانی کا کوئی رنگ، بو یا مزہ نہیں ہوتا یہ ٹھوس سیال اور گیس تینوں شکلیں اختیار کرسکتا ہے۔ پانی ہائڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہے۔ یہ آفاقی محلول (Universal Solvent) ہے۔ جب پانی میں ضرر رساں چیزیں حل ہوجاتی ہیں تو وہ آلودہ ہوجاتا ہے۔

پانی کی آلودگی سے مراد پسندیدہ اشیاء کی بڑی مقدار جیسے ٹھوس ذرات، حل شدہ نمکیات، صنعتی ناکارہ اشیاء، گرد و غبار اور حیاتیاتی اشیاء کا پانی میں پایا جانا ہے۔ یعنی پانی کی طبعی، کیمیائی یا حیاتیاتی خواص میں وہ تبدیلی جس کا استعمال نقصاندہ ہو آبی آلودگی کہلاتا ہے۔ آبی آلودگی کی اہم وجوہات میں پیٹرول اور اس سے متعلقہ اشیاء، یعنی تیل کے چشمے، صنعتی اور ان سے پیدا ہونے والا فضلہ، بجلی کے پلانٹ، زیر زمین معدنیات، انسانی فضلہ لے جانے والی نالیاں، زراعت میں استعمال ہونے والی کیڑا مار دوائیں، صابن و ڈٹرجنٹ اور انسانوں کا استعمال شدہ پانی ہیں۔

(3) زمینی آلودگی (Land/Soil Pollution):

زمینی آلودگی سے مراد قدرتی نوعیت میں تبدیلی یا اضافہ ہے۔ جس سے صرف زمین کی ظاہری شکل بھدی اور گندی ہوجاتی ہے بلکہ اس سے انسانی، حیوانی، نباتاتی زندگی اور سطح زمین و زیر زمینی پانی بھی متاثر ہوتا ہے۔

زمینی آلودگی کے ذرائع (Sources of Land Pollution):

زمین مندرجہ ذیل چیزوں سے آلودہ ہوجاتی ہے:

گندگی، فضلہ، کچرا، کوڑا کرکٹ، خصوصاً پلاسٹک اور پولی تھین وغیرہ کے انبار اسی طرح فضلہ کے لئے بنائے جانے والے گڑھے (Sewerage Tanks)' کیمیائی کارخانوں، کاغذ کے کارخانوں، کپڑے کی ملوں اور ریفائنری وغیرہ سے نکلنے والا صنعتی فضلہ اور تھرمل پلانٹس سے نکلنے والی راکھ (Fly Ash) وغیرہ فضا اور پانی کے ساتھ زمین کو بھی آلودہ کرتے ہیں۔

www.urduacademyts.com

پانی کا نظم Water Management:

انسانی زندگی کا دارومدار ہمیشہ سے زمین اور آبی ذرائع پر منحصر رہا ہے۔ جیسا کہ تاریخ کے اوراق الٹنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مین سوبٹامیاں چین، کایاٹلٹی سکبا نگ سبھی تہذیبیں ندیوں کے کنارے سے ہی شروع ہوئیں۔ چاہے وہ سندھ ندی، نیل ندی، گنگا ندی یا کوئی اور رہی ہوں۔ پہلے ہر گاؤں میں کئی تالاب ہوا کرتے تھے اور شہروں، قصبوں کے ہر محلے میں بھی لیکن آج یہ ختم ہوتے جارہے ہیں۔ اور اگر ہیں بھی تو بہت کم اور چھوٹے۔

اپنشد میں کہا گیا ہے کہ انسان کا وجود پانچ عناصر سے بنا ہے۔ یہ ہے بھومی، گگن، وایو، اگنی اور نیر یعنی زمین، آسمان، ہوا، آگ اور پانی۔ روز ازل جتنا پانی اس کرہ ارض پر تھا اتنا ہی آج بھی ہے، صرف پانی کی قسم بدلی ہے۔ یعنی جو پانی پہلے صاف شکل میں زمین کے نیچے تھا وہ اب آلودہ ہوکر اوپر آ گیا ہے۔ نالی سے نالوں میں پھر چھوٹی ندیوں سے بڑی ندیوں میں پھر سمندر میں مل کر کھارا ہوگیا ہے اور زمین کی مٹی بھی کاٹ کر لے جاچکا ہے۔ پانی میں طرح طرح کی گندگیاں، کارخانوں کا گندہ پانی، زہریلی دوائیں، کھیتوں میں ڈالنے والی کھاد، کیڑوں ومکوڑوں کو مارنے والی دوائیں، جوہری اور نیوکلیائی کچرے مل رہے ہیں اور ہمارے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا رہے ہیں۔

ہم نے بہت سے کنویں اور تالاب پاٹ دیئے ہیں۔ کہیں کھیتی کر رہے ہیں اور کہیں گھر بنا رہے ہیں۔ ماحولیاتی توازن پر اس کا بھی اثر پڑ رہا ہے۔ صاف پانی کا وجود انسانی زندگی کی بقا کے لیے نہایت ہی اہم چیزوں میں سے ایک ہے۔ یہ ہمیشہ باعزت مانا گیا، بعض نے تو اس کی پوجا بھی کی اور یہ صرف اس لیے کہ ہمارے سیارے پر ہمارے پینے کے لئے صرف ایک پرسنٹ ہی پانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مستقبل میں تیسری عالمی جنگ پانی کے مسائل پر ہوگی۔ اس کی ابتدائی جھلکیاں یا ہم کو اپنے ملک کے صوبوں اور پڑوسی ممالک کے درمیان صاف نظر آ رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟ پانی کی تقسیم پر ہو رہے ہیں جھگڑوں پر کس طرح قابو پایا جاسکتا ہے؟ کس طرح ہم ماحول کو محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ پانی کو سمندر میں جانے سے کیسے روکا جائے تاکہ وہ زمین میں جذب ہو سکے؟ کس طرح چک ڈیم بنایا جائے۔ زیادہ پانی والے علاقوں کو کم پانی والوں سے کس طرح جوڑیں، ندیوں کو آپس میں کیسے جوڑیں، زمین سے کم پانی نکال کر سب کی ضرورت کس طرح پوری کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں پانی کی سطح تیزی سے نیچے جارہی ہو وہاں سے پانی نکالنا کم کریں یا بند کریں۔ پانی پر قانون بنایا جائے' پانی کی صحیح قیمت پر کی جائے، گندا اور زہریلا پانی زمین میں جذب ہونے سے روکا جائے۔

پانی کے تحفظ کے لیے مندرجہ ذیل مشوروں پر عمل کیا جاسکتا ہے:

(i) زمین میں بڑی مقدار میں پانی جذب کرائیں۔

(ii) کنوؤں اور تالابوں کو جلا بخشی جائے۔

(iii) بڑی تعداد میں پودے لگائے جائیں۔

(iv) شہروں میں چھتوں کا پانی ٹیوب ویل کے ذریعہ پہنچانے کی اسکیموں پر عمل درآمد کیا جائے۔ اب بڑے شہروں میں **200** مربع میٹر کے مکانوں میں اس کا انتظام لازمی بھی کر دیا گیا ہے۔

(v) آبی پالیسی جسے حکومت نے **2002** عیسوی میں مرتب کیا ہے' اس پر عمل ہو۔

(vi) کارخانوں سے نکلنے والے پانی کو بغیر صاف کئے ندیوں اور نالوں میں نہ جانے دیا جائے۔

(vii) پانی بچانے کے لیے ضروری ہدایتیں لوگوں کو ٹی وی، ریڈیو، اخبار اور ذرائع ترسیل سے دی جائیں۔

(viii) پانی پر قانون بنے اور اس پر عمل کو یقینی بنایا جائے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کیلئے سزا کا اہتمام ہو۔

(ix) اس سلسلے میں مذہبی رہنماؤں سے بھی مدد لی جائے۔ ہر مذہب میں پانی کے ضیاع پر امتناع ہے۔ پانی کو نعمت کہا گیا ہے۔

(x) درسی کتابوں میں اس کے متعلق سبق ہو کہ پانی کتنا ہے، یہ کتنا اہم ہے اور اس کی بربادی سے کیا خطرات لاحق ہو سکتے ہیں' اس بارے میں تمام درجات میں بتلایا جائے۔

دانشوروں کا مشورہ ہے کہ اگر پانی دوڑ رہا ہو تو اسے چلاؤ، اگر چل رہا ہے تو اسے کھڑا کرو، اگر کھڑا ہے تو اسے بیٹھا دو، اگر بیٹھا ہے تو اسے سلا دو، اگر ان مشوروں پر نصف بھی عمل کیا جائے تب بھی ہم آنے والی نسلوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونگے۔

www.urduacademyts.com

حیاتی تنوع (Bio-Diversity):

حیاتی تنوع کیا ہے؟ شاید اسی لیے کنونشن برائے بائیولوجیکل ڈائیورسٹی کے مطابق اس نظریہ کو سمجھنے کے لئے چند رہنما اصول وضع کیے گئے ہیں۔ آسان لفظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حیاتیاتی تنوع زندگی ہے۔ حیاتی تنوع سے مراد انسان، حیوانات، پرندے، مچھلیاں اور درختوں سمیت ہر جاندار کا وجود ہے۔

ماہرین کی رائے میں موسمی تبدیلی کی بابت عالمی حدت میں اضافہ کے حیاتیاتی تنوع پر اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہمارے ملک میں انسانوں کی طرف سے قدرت کی تخلیقات میں بلا جواز مداخلت بشمول جانوروں اور پرندوں کا غیر قانونی شکار، درختوں کی کٹائی، آبی وفضائی آلودگی میں اضافہ نہ صرف حیات کو نقصان پہنچا رہا ہے بلکہ اس ماحولیاتی تباہی کا بھی سبب بن رہا ہے جو ہر جاندار کے لیے نقصان دہ ہے۔

حیاتی تنوع کو نقصان پہنچانے والے انسان اس بات سے نا آشنا ہیں کہ خود ان کی زندگیوں کا دارومدار بھی انہی حیاتیات سے جڑا ہے۔ انسان کے لیے آکسیجن نہایت ضروری ہے اور اگر آکسیجن نہیں ہوگی تو انسان بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ ہم غذا کے طور پر جو کچھ بھی استعمال کرتے ہیں اس کے بنیادی عناصر زمین سے اگائے جاتے ہیں۔ اسی طرح پانی، ہوا، بادل، بارش، ندی یا دریا، سمندر گویا کائنات میں پھیلی یہ تمام اشکال ایک مخصوص عمل سے گزرنے کے بعد ہم تک پہنچتی ہیں۔ حیاتیاتی تنوع اسی مخصوص عمل کو برقرار رکھنے کا کام سرانجام دیتا ہے۔

ماحولیاتی سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ ہماری دنیا میں سے ہر روز **150** سے **200** نباتاتی اور حیواناتی انواع ختم ہورہی ہے ایک بار ایک نوع ختم ہوتی ہے تو ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتی ہے۔ سائنسداں کہتے ہیں کہ جس تیزی سے انواع ختم ہورہی ہیں معلوم کائناتی تاریخ میں اس کی نظیر صرف ڈائناسورس کے خاتمے کے دور میں ملتی ہے۔ اس سے ہزاروں لاکھوں برسوں سے انواع کو کوئی بڑا خطرہ نہیں تھا۔ اب پھر تیزی سے انواع کا ضیاع شروع ہوگیا ہے۔ قدرتی اور بشریاتی عمل کی وجہ سے جانوروں اور پودوں کی نایاب اقسام ان کا قدرتی ماحول اور جغرافیائی محل وقوع شدید خطرے میں ہے۔ درحقیقت اس کرہ ارض کے نظام کو ایک خاص ترتیب میں رکھنے کے لئے ہی جاندار ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اگر یہ ختم ہوگئے تو کرہ ارض کا نظام بھی شدید طور پر متاثر ہوگا۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً ۔سورۃ آل عمران' آیت: **191**

مفہوم: اے ہمارے رب تو نے اس دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں بنائی۔

نباتات اور حیوانات کی ہر نوع کے ذمہ اس دنیا کو چلانے کے لئے کوئی نہ کوئی اہم کام دیا گیا ہے۔ ان انواع کا خاتمہ دراصل ان کے ذمہ کئے گئے کاموں کا رک جانا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان کے بشمول کائنات کی ہر مخلوق تکلیف کا شکار ہوتی ہے۔ سمندروں میں موجود ننھے منے **Plantkons** فضا میں موجود کاربن ڈائی آکسائڈ کے تناسب کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سمندر کے درجہ حرارت کے بڑھ جانے سے ان کے ضیاع کو گرین ہاؤس گیسوں کے تناسب کو بڑھانے کا ایک اہم سبب مانا جاتا ہے۔ چوہے کھانے والے سانپوں اور مچھروں کے انڈے کھانے والے مینڈکوں کے بغیر انسانوں کی زندگی مشکل ہے۔ یہ نہ ہوں تو طاعون اور ملیریا کی دوائیں **(Medicines)** آناً فاناً انسان کا خاتمہ کردیں گی۔ بعض انواع کے کاموں کو ہم جانتے ہیں لیکن نباتات اور حیوانات اور خاص طور پر آنے والے جرثوموں کی کروڑوں قسمیں ہماری زندگی کی حفاظت اور بقا کے لئے اللہ کے حکم سے جو خاموش کام کررہی ہیں ان کا ہمیں پتہ بھی نہیں ہے۔ اس لئے ان کا ضیاع ہمارے لئے کیسی کیسی قیامتیں برپا کرسکتا ہے، اس کا اندازہ بھی ہم نہیں لگا سکتے ہیں۔ حیاتیاتی تنوع کو یقینی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ قدر زیادہ ممکن ہوسکے شجرکاری کی جائے، فیکٹریوں اور گھروں کی گندگی پانی میں نہ پھینکی جائے، زہریلے دھوئیں کے اخراج پر کنٹرول کیا جائے۔

قابلِ بقا ترقی:

1980ء کے دہے سے عالمی سیاست میں قابل بقا ترقی کی اصطلاح مروج ہے۔ یہ ایک معاشی اور تکنیکی تصور ہے جس کا مقصد کرۂ ارض پر انسانی آبادی کی بقا اور حیاتی تنوع **(Bio-Diversity)** کی بقا ہے۔ جو انسان کی معاشی، صنعتی اور خوشحالی کی سرگرمیوں کی وجہ سے زوال پذیر ہے۔ قابل بقا ترقی کے تصور کو باضابطہ طور پر پہلی بار عالمی کمیشن برائے ماحول وترقی **(Commosion on Environment and Development,1980)** کے سربراہ ناروے کے وزیر اعظم **Dr.Gro Harlem Brundt Land** (جنہیں سال **2004**ء میں دنیا کو قابل بقا ترقی سے روشناس کروانے کے لئے **Blue Print** انعام

www.urduacademyts.com

بھی عطا کیا گیا ہے) نے اپنی رپورٹ ''ہمارا مشترکہ مستقبل'' (Our Common Future) میں قابل بقا ترقی کا تصور پیش کیا تھا جس کو Brundt Land رپورٹ بھی کہا جاتا ہے۔اس رپورٹ میں انہوں نے قابل بقا ترقی کی تعریف اس طرح کی ہے:

''ترقی جو مستقبل کی نسلوں کو ان کی ضرورتوں سے نمٹنے کی صلاحیتوں سے سمجھوتہ کئے بغیر حال کی ضرورتوں کو پورا کرے۔''

چنانچہ اس تعریف کے تین پہلو ہیں۔

(i) معاشی ترقی و پالیسیوں کو ماحولیاتی تناظر سے جوڑنا۔

(ii) مناسب تناسب میں فرق کا جائزہ لینا۔

(iii) انصاف کا تقاضہ کا ہے کہ انسان آئندہ نسلوں سے متعلق بھی غور وفکر کرے۔

عالمی کمیشن برائے ماحول وترقی نے قابل بقا ترقی کے دو بنیادی تصورات پیش کئے:

(i) دنیا کے غریبوں کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔

(ii) موجودہ اور مستقبل کی ضروریات کی تکمیل کے لئے وسائل کو دیکھ سمجھ کے استعمال کیا جائے۔

قابل بقا ترقی کے اصول:

قابل بقا ترقی کے اصول حسب ذیل ہیں:

(i) سماجی زندگی کا احترام اور تحفظ کیا جائے۔

(ii) عوام کے معیاری زندگی میں اضافہ کیا جائے،

(iii) زمین کی حیاتیاتی قوت اور متنوع صلاحیتوں کا تحفظ کیا جائے۔

(iv) ناقابل تجدید وسائل کا کم سے کم استعمال کیا جائے۔

(v) ماحولیات کے تحفظ کے متعلق انفرادی رویوں اور سرگرمیوں میں تبدیلی لائے جائے۔

(vi) اپنے سماج کے اطراف واکناف کے ماحول کو تحفظ کے قابل بنائیں۔

(vii) ترقی وتحفظ میں ہم آہنگی کے لئے قومی لائحہ تشکیل دیا جائے۔

(viii) امینی وسائل کا استعمال اپنی ضرورت کے مطابق ہی کیا جائے۔

قابل بقا ترقی کے لوازمات:

1. موڈرن ٹیکنولوجی کا استعمال
2. دابارہ استعمال پر توجہ
3. ماحولیاتی شعور کو اجاگر کرنا
4. ضرورت کے مطابق ہی وسائل کا استعمال

تحفظ ماحول (Conservation):

ماحول کو بحران سے تحفظ کرنے کا مطلب ہے وسائل قدرت کا زیادہ سے زیادہ تحفظ اور کم سے کم استحصال۔ ماحولیاتی بحران کے دو پہلو ہیں: اوّل آفات سماوی اور دوم انسانی بداعمالیاں۔آفات سماوی پر قدرت حاصل کرنا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ہاں انسان اپنی بداعمالیوں یعنی قدرتی

www.urduacademyts.com

وسائل کے بے تحاشہ استحصال پر قابو حاصل کر کے یا اس کے استعمال میں ہوشیاری اور اس کے متبادل تلاش کر کے قدرتی وسائل کو زیادہ سے زیادہ دنوں تک ساتھ دینے کے لائق بنایا جا سکتا ہے۔ وسائل قدرت کا منصوبہ بند، مناسب اور دانشمندانہ استعمال ہی اسکا تحفظ، بالفاظ دیگر ماحول کا تحفظ ہے۔ تحفظ کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ قدرتی وسائل کا استعمال بند کر دیا جائے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قدرتی وسائل کے استعمال اور ان کی پیداواری کے درمیان ایک مناسب توازن برقرار رکھا جائے۔ قدرتی وسائل کو انسان اپنا سرمایہ سمجھ کر خود کو ترقی دے۔ بالفاظ دیگر قدری وسائل کا کم سے کم غلط مصرف۔ ان کی کم سے کم بربادی اور ان کا کم سے کم استحصال۔ مٹی جیسی دولت کی زرخیزی قائم رکھنا، اسے کٹاؤ اور منتقلی سے بچانا اور جنگل جیسی دولت کے زیادہ سے زیادہ استحصال کی صورت میں اس کے ازسرنو قیام کی کوشش کرنا، ان کا تحفظ ہی کہلائے گا۔

تحفظ ماحول، یعنی تحفظ وسائل قدرتی لازمی ہے۔ دنیا کی آبادی آج سے دو سال قبل جہاں پون ارب تھی وہاں اب 7 ارب پہنچ چکی ہے۔ ہماری ضروریات غذا، لباس، رسل و رسائل کے وسائل، مختلف اقسام کے آلات، صنعتی کچے مال وغیرہ کئی گنا بڑھ گئی ہیں اور اس وجہ سے ہم قدرتی وسائل کا تیزی سے غلط اور تباہ کن ڈھنگ سے استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ مثال کے لئے مٹی کا کٹاؤ، چٹانوں کا کھسکنا وغیرہ بڑھ گئے ہیں۔ زمین کے غلط استعمال سے اس کی پیداواری صلاحیت کم ہوگئی ہے۔ کئی خطوں نے معدنیات کا محفوظ خزانہ ختم کر دیا اب بالکل ختم ہو جانے کی حالت میں ہے۔ ہم ہوا اور پانی کو قدرت کا مفت عطیہ سمجھ کر آلودہ کرنے میں لگے ہیں۔ مختلف اقسام کے نباتا اور حیوانات کا بھی خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان قدرتی توازن کو بگاڑنے میں لگا ہے۔ اگر قدرتی توازن بگڑا تو پوری نسل انسانی ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لہٰذا انسان کے وجود اور بقا کے لئے قدرتی وسائل اور ماحول کا تحفظ لازمی ہے۔

☆☆☆

سونور جک
اسسٹنٹ پروفیسر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، دربھنگہ

اور

آفتاب عالم
اسسٹنٹ پروفیسر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، دربھنگہ

منتخب اشعار

ہم بھی کرلیں جو روشنی گھر میں
پھر اندھیرے کہاں قیام کریں

ooo

چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں
نیا ہے زمانہ نئی روشنی ہے

خمارؔ بارہ بنکوی

www.urduacademyts.com

قرآن کا ماحولیاتی تصور

اس وقت پوری دنیا بالعموم ترقی یافتہ ممالک بالخصوص ماحولیاتی بحران سے گزر رہے ہیں، اکثر ترقی یافتہ ممالک کی فضا آلودہ ہوتی جارہی ہے اور اس انسانی بستی کا مستقبل تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ 'world quality index s air pollution کے مطابق دنیا کے اکثر ترقی یافتہ شہر آلودگی میں سرفہرست ہیں۔

مشرقی امریکا اور وسط یوروپ کے بعض ممالک اور آسٹریلیا کے علاوہ اکثر ممالک فضائی آلودگی کے معاملہ میں خطرہ کے دائرے میں ہیں۔ مذکورہ ادارے کی ایک اور فہرست میں ان ممالک کی فہرست بندی کی گئی ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ کس ملک کی فضائی ماحولیاتی حالت کیا ہے؟ زیادہ تر ممالک کی فضا زہر آلود ہوچکی ہے جس میں سرفہرست چائنا کے علاوہ ہمارا ملک ہندوستان بھی شامل ہے۔(۱)

تحقیق کی معنویت:

ان ممالک کی صورت حال دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ماحولیاتی مطالعہ اس وقت کا کتنا اہم اور نازک موضوع تحقیق ہے۔ جہاں تک اس مقالے کا تعلق ہے تو اس کی اہمیت اس اعتبار سے ممتاز اور قابل توجہ ہے کہ عام طور سے ماحولیاتی مسائل کے حل کے لئے سائنسی تجاویز وتحقیقات پیش کی جاتی ہیں جو بلاشبہ بہت اہم ہیں، لیکن ادھر چند دہائیوں سے مختلف مذہبی نصوص کی روشنی میں بھی ماحولیاتی مسائل پر تحقیق کا سلسلہ شروع ہوچکا ہے۔ اسی تناظر میں جب ہم اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی تعلیمات میں ہمیں بے شمار ایسی ہدایات ملتی ہیں جن کی روشنی میں ماحولیات کا تحفظ کیا جاسکتا ہے اور دنیا والوں کے سامنے فطرت دوست ماحول پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس تحقیق میں قرآنی آیات کی روشنی میں چند ایسی ہی ماحولیاتی ہدایات اور تعلیمات کو پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ماحولیات اور قرآن کا ربط:

بظاہر قرآن اور ماحولیات دو مختلف موضوعات ہیں اور جس وقت قرآن کا نزول ہورہا تھا اس وقت ماحولیاتی مسائل بھی نہیں تھے، اس کے باوجود دونوں موضوعات کا ربط کس طرح ممکن ہے؟ اور قرآن جیسا کہ خود دعوی کرتا ہے کہ کتاب ہدایت ہے، ان موضوعات سے اس کا کیا تعلق ہے؟ آیئے ذیل کی سطور میں اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کا اصل موضوع ہدایت ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن میں دوسرے موضوعات سرے سے ذکر ہی نہیں ہوئے ہیں، بلکہ قرآن میں مختلف مضامین وموضوعات کا تذکرہ ملتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے الفوز الکبیر میں قرآنی موضوعات کو پانچ اقسام میں بانٹا ہے:

1۔ **''علم احکام (فقہ):** جیسے عبادات، معاملات، معاشرت اور سیاسیات وغیرہ میں واجب، مستحب، جائز، مکروہ، حرام وغیرہ کے احکامات۔

2۔ **علم الجدل (الکلام):** اس ضمن میں چاروں باطل مذاہب سے مباحثہ اور ڈبیٹ کی گئی ہے، جس میں یہود ونصاری، مشرکین اور منافقین شامل ہیں، جس کے نتیجے میں علم الکلام کا فن وجود میں آیا۔

3۔ **خدا کی نعمتوں کا علم (آیات اللہ):** جس میں زمین وآسمان کی تخلیق اور بندوں کی ضروریات کی ہدایات اور خدا کے اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

4۔ **تاریخی واقعات اور حوادث کا علم:** اس میں ان واقعات وحوادث کو بیان کیا گیا ہے جو اللہ کی طرف سے مختلف تاریخی ادوار میں برپا کئے گئے، جن میں نیکوں پر اللہ کے انعامات ہوئے اور بروں پر اللہ کا عذاب آیا۔

5۔ **موت اور اس کے بعد کی زندگی کا علم:** جیسے، حشر نشر، حساب کتاب، جنت دوزخ وغیرہ کا تذکرہ۔

شاہ صاحب کی مذکورہ عبارت کو ذکر کرنے کے دو مقاصد ہیں۔ پہلا یہ کہ قرآن کے موضوعات کئی ہیں۔ شاہ صاحب نے پانچ گنائے ہیں جبکہ بعض علماء نے

ماحولیات

www.urduacademyts.com

اس سے زیادہ بھی لکھے ہیں۔ بہرحال اس سے یہ تو واضح ہوگیا کہ قرآن کے موضوعات بہت سے ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاہ صاحب کی اس تقسیم کے دائرے میں خدا کی نعمتوں جس میں زمین وآسمان کی تخلیق، سمندر، نباتات، جمادات اور حیوانات کا تذکرہ کیا گیا، اس کے عموم میں ماحولیات کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ماحولیاتی سائنسداں اس کی تعریف کے عموم میں فضائی، آبی، نباتاتی وحیواناتی عناصر کو شامل کرتے ہیں اور قرآن پاک میں اس موضوع سے متعلق مختلف انداز میں کہیں اشارۃً اور کہیں صراحتاً ذکر کیا گیا ہے، جس کا احاطہ شاہ صاحب نے اللہ کی نعمتوں کے ضمن میں کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن میں کائنات، آبی، فضائی، حیاتیاتی اور نباتیاتی زندگی کا جو تذکرہ کیا گیا ہے اس کا مقصد خدا کی معرفت اور اس کی ذات تک رسائی ہے، یقیناً ان آیات سے انسانی علوم اور زندگی میں دوسرے نکات اور فوائد بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں لیکن بنیادی فائدہ اور مقصود معرفت الٰہی ہے۔ ''قرآن کتاب ہدایت ہے'' سے میری نظر میں یہی مراد ہے۔ (۲)

قرآن کا ماحولیاتی تصور:

اس موضوع پر بات کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ماحولیات کی ایک جامع تعریف کردی جائے تاکہ اس کا اندازہ ہوسکے کہ ماحولیات کے عموم میں کیا کیا عناصر اور چیزیں شامل ہیں، تاکہ آگے کی بحث سمجھنا آسان ہوسکے۔

ماحولیاتی علماء جیسے چیپ مین، جی۔ آر۔ چتول اور ہریش شرما کی تعریفات کے مطابق ماحولیاتی مطالعہ حیاتیات اور اس سے متعلق ماحولیات کے مطالعہ کا نام ہے جو ایک وسیع علم ہے جس کے تحت زمینی، فضائی، آبی، حیاتیاتی اور انسانی امور سے متعلق پیدا ہونے والے احوال ونتائج سے بحث کی جاتی ہے۔ (۳) یعنی اس کے عموم میں کائنات، فضائی، آبی، زمینی، طبیعیاتی اور حیواناتی زندگی کا مطالعہ شامل ہے۔

قرآن کریم کا جب ہم ماحولیاتی تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے کچھ سوالات ذہن میں آتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

- قرآن کائنات کے تئیں کیا نظریہ رکھتا ہے؟
- قرآن کائنات کے تئیں انسانوں میں کون سا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے؟
- قرآن کی کائنات کے تحفظ کے سلسلے میں کیا ہدایات ہیں؟

ذیل میں ہم ان سوالات کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

قرآن کا کائنات کے تئیں نظریہ:

قرآن کریم کا ماحولیات کے تناظر میں مطالعہ کرنے سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ قرآن کائنات، زمین وآسمان، حیاتیات ونباتیات اور فضائی عناصر کو ''نعمت'' سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی تعلیمات کے مطابق کائنات اور اس کی تمام مخلوقات جس کے عموم میں biotic اور abiotic (حیاتیاتی اور غیر حیاتیاتی) دونوں عناصر شامل ہیں، یہ سب انسان کے فائدے کے لئے ہیں، وہ انہیں اپنی ضرورت کے لئے استعمال کرے۔ لیکن نہ تو وہ اس میں افراط وتفریط کرنے کا حق رکھتا ہے اور نا ہی وہ اس میں خیانت کرسکتا ہے، بلکہ خدا کی اس نعمت کو وہ بطور امانت استعمال کرے۔ ظاہر ہے کہ امانت کے تصور میں یہ جذبہ خود بخود پوشیدہ ہے کہ وہ ان نعمتوں کو اپنی ضرورت کے بقدر استعمال کرے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے اسے قابل استعمال حالت میں باقی رکھے، جسے ہم ماحولیات کی اصطلاح میں sustainable development کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں جن آیات سے رہنمائی ملتی ہے ہم مختصراً ان کا تذکرہ کرتے چلتے ہیں:

- وہی (خدا) ہے جس نے پیدا کیا، تمہارے لئے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب (البقرۃ:۹۲) (۴)
- وہی (پروردگار) ہے، جس نے تمہارے لئے زمین کو ایک فرش اور آسمان کو ایک چھت بنادیا۔ (البقرۃ:۲۲) (۵)
- اور اللہ نے تمہارے لئے چوپائے بھی پیدا کئے، جن میں تمہارے لئے جاڑے کا لباس ہے، متعدد فائدے ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ (النحل:۵) (۶)
- نیز گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا فرمائے، تاکہ تمہاری سواری اور زینت کے کام آئیں، اور ایسی چیزیں بھی پیدا کیں جن سے تم واقف نہیں ہو۔ (النحل:۸) (۷)

www.urduacademyts.com

- وہی خدا ہے جس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا، جس میں سے کچھ پینے کا ہے اور کچھ پانی سے درخت سیراب ہوتے ہیں، جس میں تم چرایا کرتے ہو۔ (النحل:۱۰)(۸)
- اللہ اس سے (پانی) تمہارے لئے کھیتی، زیتون، کھجوریں، انگور اور ہر قسم کے میوے اگاتے ہیں، یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے، جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔ (النحل:۱۱)(۹)
- اور تم اگر اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہیں کر سکتے، بے شک اللہ بہت بخشنے والے اور نہایت مہربان ہیں۔ (النحل:۸۱)(۱۰)

طوالت کے پیش نظر منتخب آیات کو ہی نقل کیا گیا ہے، ان آیات میں کائنات اور اس کی مختلف مخلوقات کو نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، اور انسانوں کے دل میں فطرت اور قدرت سے پیدا ہونے والی نعمتوں کے لئے جذبہ تشکر اور رحم کے ساتھ ان کے صحیح استعمال کی تعلیم دی گئی ہے۔ ماحولیاتی نقطہ نظر سے یہ آیات انسان کو فطرت سے محبت اور اس کے صحیح استعمال کی طرف رہنمائی کرتی نظر آتی ہیں۔

قرآن کے تناظر میں کائنات اور انسان کا رشتہ:

جب ہم قرآن میں انسان اور کائنات کے رشتہ کے تعلق سے غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں ''خلیفہ'' کا تصور نظر آتا ہے، جو بہت وسیع اور محیط تصور ہے۔ مختصراً یہ سمجھ لیا جائے کہ اللہ پاک نے انسان کو اس کائنات میں اپنا ''نائب'' بنا کر بھیجا ہے۔ وہ اس کائنات کی ہر مخلوق کا امین اور محافظ ہے، انسان اس کائنات کی کسی شئے کا مالک حقیقی نہیں ہے بلکہ وہ امین ہے، اسے کائنات کی کسی مخلوق کی ناحق جان لینے کا یا عرصہ حیات تنگ کرنے کا حق نہیں ہے، سوائے جائز طریقے کے۔ وہ کائنات میں ایسا ماحول نہیں پیدا کر سکتا کہ خدا کی دوسری مخلوق کا عرصہ حیات تنگ ہو جائے بلکہ ''خلیفۃ اللہ'' ہونے کے ناطے اس کی ذمہ داری ہے کہ کائنات کا ایسا سازگار اور متوازن ماحول قائم رکھے جو خدا نے فطری طور پر تخلیق کیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں اللہ پاک نے مختلف آیات میں عدل، توازن اور اعتدال کی طرف بہت سے اشارات کئے ہیں کہ یہ کائنات بہت زیادہ توازن اور اعتدال کے ساتھ بنائی گئی ہے۔ لہذا اس خوبصورت اور فطرت سے بھرپور کائنات کے درخت کاٹ کر، پہاڑ کو کنکریٹ جنگل میں تبدیل کر کے، آبی ذخائر کو زہریلے کیمیکلس سے آلودہ کر کے اور خدا کی صاف وشفاف ہوا کو ایندھن کے ذریعہ آلودہ کر کے زمین اور سمندر میں ''فساد'' مت مچاؤ۔ ایسا کرنے والوں کو سخت تنبیہ کی گئی۔ دیگر مخلوق کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ وہ بھی خدا کی پیدا کردہ مخلوق ہیں اور سب کے سب اس کے مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان پر ظلم کرنا یا انہیں تکلیف پہچانا قابل سرزنش گناہ ہے۔ مخلوقات کے سلسلے میں قرآن کا یہ تصور ماحولیات کی وہ اعلیٰ تعلیم پیش کرتا ہے جس پر عمل کر کے دنیا کو جنت بنانا کوئی ناممکن نہیں ہے۔ اس سلسلہ کی چند آیات کے ترجمے پیش کئے جا رہے ہیں:

- اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں اپنا ایک نائب بنانے جا رہا ہوں۔ (البقرۃ:۳۰)(۱۱)
- سورج اور تارے اسی کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ (الرحمان:۴)(۱۲)
- اسی نے آسمان کو بلند کیا اور ترازو قائم کی۔ (الرحمان:۷)(۱۳)
- اور اسی نے مخلوق کے لئے زمین بچھادی۔ (الرحمان:۱۰)(۱۴)
- ساتوں آسمان، اور زمین اور اس کے درمیان جو کچھ ہے وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتا ہے، اور ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے۔ بے شک اللہ بہت بردبار اور بے حد معاف کرنے والے ہیں۔ (بنی اسرائیل:۴۴)(۱۵)

مذکورہ بالا آیات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کے لئے کائنات اور اس کی مخلوقات اور فطرت کے تئیں بہت مثبت اور ہمدردانہ رویہ کو پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ ماحولیات کی حفاظت اور اس کی بقاء کے لئے بے حد ضروری ہے کہ انسان ماحولیات سے فطری لگاؤ رکھے، اس کی حفاظت اور بچاؤ کا جذبہ اس میں کارفرما ہو۔ قرآن میں بے شمار ایسی آیات ہیں جو انسان کے دل میں اس پرفریب اور دلکش کائنات سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ اسی طرح قرآن میں تقریباً ۷۱ سورتوں کے نام کسی حیوان یا کائنات کی کسی دوسری مخلوق کے نام پر ہیں، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن ان مخلوقات کو کتنی اہمیت دیتا

www.urduacademyts.com

ہے۔مثال کے طور پر: گائے، چوپائے، شہد کی مکھی، چونٹی، مکڑی، چاند، سورج، رات، بجلی، وغیرہ کے نام پر سورتیں ہیں۔ ماحولیات کے تحفظ اور بقاء کے لئے ایسا ماحول بیحد ضروری ہے، ان آیات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات ایک ماحول دوست فضا قائم کرنے کی ہدایات دیتی ہیں۔

تحفظ کائنات اور قرآنی ہدایات:

قرآن نے تحفظ کائنات، مخلوق اور نعمتوں کے سلسلے میں مختلف جگہوں پر مختلف پیرائے اور اسلوب میں ہدایات دی ہیں جس میں سب سے بنیادی اصطلاح ''فساد'' کی استعمال کی ہے۔اس کے علاوہ قرآن نے ''غلو''، ''تبذیر''، ''اسراف'' ''ناشکری'' جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ قرآن نے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کی ایک تعبیر استعمال کی ہے، جس کے عموم میں ماحولیاتی تحفظ بھی داخل ہونا چاہئے۔قرآن ایک صحت مند زندگی کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان کے اندرون کا ماحول بھی پاکیزہ ہو اور بیرون کا بھی، اور اس کے ماننے والے ہر غلط کام سے دوسرے کو روکیں اور اچھے کام کی ترغیب دیں۔آیئے ہم اس سلسلے میں قرآن کی چند آیات کو مطالعہ کرتے ہیں:

- جب انہیں حکومت مل جاتی ہے تو زمین میں فساد مچاتے ہیں تا کہ کھیتوں اور جانوروں کو ہلاک و برباد کر دیں۔اور اللہ کو فساد کو پسند نہیں کرتے۔

(البقرۃ:۲۰۵)(۱۶)

- لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا، تا کہ اللہ ان کو ان کے بعض کاموں کا مزہ چکھائیں، شاید کہ وہ باز آجائیں۔

(الروم:۴۱)(۱۷)

- بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

(بنی اسرائیل:۲۷)(۱۸)

- یہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں، نیکیوں کی طرف لپکتے ہیں اور یہی نیک لوگ ہیں۔

(آل عمران:۱۱۴)(۱۹)

- مرد اور عورت میں سے جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا اور وہ مومن ہوگا تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کو ان کے نیک اعمال کا بدلہ ضرور دیں گے جنہیں وہ انجام دیتے تھے۔

(النحل:۹۷)(۲۰)

- اور کھاؤ پیو لیکن اسراف مت کرنا، بے شک اللہ پاک اسراف کرنے والوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

(الاعراف:۳۱)(۲۱)

جہاں تک ''فساد'' اور ماحولیات پر اس کے اطلاق کا تعلق ہے تو آگے اس پر تفصیل سے گفتگو ہوئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماحولیات کے معنی میں اس کے مفہوم کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، اور خود قرآن کی آیت میں اس مفہوم کی طرف اشارہ ملتا ہے۔اسی طرح ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے عموم میں ماحولیات کے سلسلے میں اوامر و نواہی کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ یہ ''معروف'' اور ''منکر'' مطلق الفاظ ہیں، یقیناً ان کے بنیادی معنی تو احکام الٰہی کی پابندی ہے لیکن عمومی معنی میں ماحولیات کے مسائل کو شامل کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ قرآن خود ''حیات طیبہ'' کی بات کرتا ہے، اور ایک صحت مند زندگی کے لئے ضروری ہے کہ فضا اور ماحول آلودگی سے پاک ہوں۔لہذا مذکورہ آیات کی روشنی میں قرآن ہمیں تحفظ کائنات اور ماحول کی تعلیمات دیتا ہے۔

لفظ ''فساد'' کی ماحولیاتی تفسیر:

قرآن میں بہت سے الفاظ ایسے آئے ہیں جن کے ایک سے زیادہ معنی مراد ہو سکتے ہیں، زمانے اور ماحول کے مطابق مختلف مفسرین نے ان کے معنی دوسرے سے مختلف مراد لئے ہیں۔انہی الفاظ میں سے ماحولیات سے متعلق ایک لفظ ''فساد'' ہے۔ لفظ فساد اپنے معنی میں کافی وسعت اور تنوع رکھتا ہے۔عربی زبان میں اس کے معنی قتل و غارت گری، بدعنوانی، عدم امن، بے راہ روری کے آتے ہیں، جس کی تعریف مفردات القرآن میں کچھ یوں کی گئی ہے: کسی شئے کا حد اعتدال

www.urduacademyts.com

سے نکل جانا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس لفظ کو ماحولیاتی معنی میں استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اور اس کی کہاں تک گنجائش ہے؟ آیئے پہلے خود قرآن میں دیکھیں کہ یہ لفظ کن معنوں اور تناظر میں استعمال ہوا ہے؟

- سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر ۲۰۵ میں اللہ پاک بعض بدلوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: جب انہیں حکومت مل جاتی ہے تو زمین میں فساد مچاتے ہیں ۔تا کہ کھیتوں اور جانوروں کو ہلاک و برباد کردیں۔اور اللہ کو فساد کو پسند نہیں کرتے۔(۲۲)
- دوسری جگہ سورۃ مائدہ کی آیت نمبر ۳۲ میں بنی اسرائیل کے قوانین کا تذکرہ کرتے ہوئے لفظ فساد کو قتل وغارت گری کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔(۲۳)
- سورہ مائدہ ہی میں آیت نمبر ۳۳ میں فساد سے مراد قتل لیا گیا ہے۔(۲۴)
- سورۃ مائدہ کی آیت نمبر ۶۴ میں یہودیوں کے تذکرہ میں لفظ فساد کو لڑائی جھگڑے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔(۲۵)
- سورۃ انفال کی آیت نمبر ۷۳ میں کفر کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔(۲۶)
- سورۃ ہود کی آیت نمبر ۱۱۶ میں لفظ فساد کو مطلق استعمال کیا گیا ہیکہ جو لوگ تم سے پہلے گذرے ہیں ان میں کچھ ایسے سمجھدار کیوں نہیں ہوئے جو زمین میں فساد مچانے سے روکتے۔(۲۷)
- سورۃ قصص کی آیت نمبر ۷۷ میں اللہ کی طرف سے یہ ہدایت دی جارہی ہے کہ اللہ کی دی ہوئی دولت کے ذریعہ آخرت کی بھی جستجو کرو اور دنیا میں بھی اپنا حصہ فراموش مت کرو، جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے، تم بھی بھلائی کرو اور زمین میں فساد اور بگاڑ مت چاہو، یقیناً اللہ بگاڑ کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔(۲۸)
- سورۃ قصص کی آیت نمبر ۸۳ میں اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آخرت کا گھر ہے، ہم یہ ان لوگوں کو عطا کریں گے جو زمین میں نہ اپنی بڑائی چاہتے ہوں نہ بگاڑ پیدا کرنا، (اللہ کی نافرمانی سے) بچنے والوں کے لئے ہی بہتر انجام ہے۔(۲۹)
- سورۃ الروم کی آیت ۱۴ میں فساد کو لوگوں کی بداعمالیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی چیز قرار دیا گیا ہے۔(۳۰)
- سورۃ المومن کی آیت ۲۶ میں حضرت موسیٰ کے قصے میں فرعون کے بارے میں کہا گیا ہے'' مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارے دین کو بدل ڈالے یا ملک میں فساد پیدا کردے۔''(۳۱)
- سورۃ الفجر کی آیت ۱۲ میں فرعون کے تذکرہ میں لفظ فساد کو سرکشی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔(۳۲)

قرآن کی ان مذکورہ بالا بارہ آیات میں لفظ ''فساد'' کو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جس میں کہیں کھیتوں اور جانوروں کو تباہ کرنا، کہیں قتل وغارت گری کرنا، کہیں کفر کرنا، کہیں اخلاقی برائی، خدا کی نافرمانی، کہیں بداعمالیوں کے نتائج اور کہیں تبدیلی مذہب اور سرکشی کے ساتھ اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ماحولیات کے تناظر میں اگر غور کیا جائے تو سورۃ بقرہ کی ۲۰۵ اور الروم کی آیت ۱۴ سے یہ مفہوم بہ آسانی نکالا جاسکتا ہے کہ اس سے ایک معنی زمین میں خدا کی طرف سے قائم کردہ توازن اور عدل کو انسانی ذرائع سے نقصان پہنچانے کا ایک معنی فساد فی الارض بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔سورۃ بقرۃ کی مذکورہ آیت میں کچھ گناہ گاروں کے تذکرہ میں یہ بات کہی گئی کہ جب انہیں حکومت ملتی ہے تو وہ کھیتیوں کو برباد کرتے ہیں اور جانوروں کو تباہ کردیتے ہیں' ایسے لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے۔اس آیت میں سبزہ کاری اور جانوروں کی تباہی کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں عناصر ماحولیات کی بنیاد میں سے ہیں۔ اگر اسے ماحولیات کی زبان میں کہا جائے تو قرآن یہاں پر Biological Environment کی بات کر رہا ہے، جس کے اندر نباتات وحیوانات شامل ہوتے ہیں، چتول اور شرما نے اس حیاتیاتی عنصر کو ماحولیات کی بنیادی اقسام میں شمار کیا ہے۔ لہذا یہ آیت ماحولیات کے مفہوم کے ساتھ پوری مطابقت رکھتی ہے اور ماحولیاتی تحفظ کے سلسلے میں زبردست ہدایت دیتی ہے۔(۳۳)

اسی طرح سورۃ الروم کی آیت نمبر ۱۴ کا مفہوم مطلق ہے، جو فساد کو انسانی بداعمالی کے نتائج سے تعبیر کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا ایک مفہوم تو نیک اور بداعمال ہیں اور اس مفہوم میں فساد کا مطلب اخلاقی و دینی بگاڑ ہوگا، لیکن اسی کے ساتھ آیت کے عموم میں اس کی گنجائش ہے کہ اس سے مراد آبی اور زمینی علاقے میں قدرتی ماحول کے توازن کو بگاڑنا بھی ہوسکتا ہے۔اس تشریح میں آبی علاقے میں فساد کا معنی زیادہ واضح اور موجودہ زمانے کے عین مطابق ہوگا۔ ماحولیات

www.urduacademyts.com

کی اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گوقرآن یہاں Biosphere اور Lithosphere کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ یہاں مذکورہ آیت کی تشریح جومولانا خالد سیف اللہ صاحب نے کی ہے اس کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا۔

آسان تفسیر قرآن میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اس آیت کی تشریح میں اصل بگاڑ تو اخلاقی اور فکری اور عملی مراد لیتے ہیں لیکن ساتھ میں یہ اشارہ بھی کرتے ہیں کہ اس سے کائنات کے قدرتی نظام کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ دنیا میں تمام چیزیں، سمندر، درخت، پانی، پہاڑ، ہوا، برف کی چٹانیں، جنگلی جانور وغیرہ دنیا کے ماحول کو مخلوق کے لئے سازگار بناتے ہیں، خدا کی ان تمام نعمتوں کو دھواں، ایندھنوں سے نکلنے والے ذرات اور پانی میں گندگیاں اور صنعتی فضلات پھیلا کر قدرتی ماحول کو تباہ کرنا بھی فساد میں شامل ہے۔(۳۴)

مذکورہ بالا دو آیات تو براہ راست ماحولیات کے مفہوم پر دلالت کرتی ہیں، اور دونوں سے ماحولیاتی تحفظ کا پیغام ملتا ہے۔اس کے علاوہ بھی بعض آیات جو مطلق ہیں، ان سے بھی اس طرح کا مفہوم لے نے کی گنجائش ہے، مثال کے طور پر سورۃ ہود کی آت نمبر ۶۱۱، سورۃ قصص کی آیت نمبر ۳۸ اور ۷۷ کے عمومی مفہوم سے ماحولیات کے معنی میں لفظ فساد مراد لیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ: ماحولیات کی روشنی میں قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن اصولی طور پر کائنات اور فطرت سے محبت اور دوستی کی تعلیم دیتا ہے، وہ انسان کو کائنات کا مالک نہیں بلکہ امین قرار دیا تا ہے۔اسی طرح قرآن ماحول اور کائنات کی نعمتوں کو تباہ و برباد کرنے والوں کو سخت وعید سناتا ہے اور انہیں ناپسند کرتا ہے۔اسی کے ساتھ قرآن سارے انسانوں اور بطور خاص اپنے ماننے والوں پر یہ فریضہ عائد کرتا ہے کہ وہ خدا کی اس کائنات کی حفاظت کریں، اس میں فساد نہ پھیلائیں اور جو لوگ ایسا کررہے ہیں انہیں اس سے روکیں، قرآن جگہ جگہ اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ لوگوں کو تخریب کاری اور برائی سے روکیں اور تعمیر اور اچھائی کو کرنے کی تلقین کرتے رہیں، گویا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم ماحول کو خراب کرنے والوں کو روکیں اور ماحول کو بہتر بنانے کے لئے کوششیں کریں، کیوں کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو خدا کی ہر مخلوق تباہی و بربادی سے دوچار ہوگی اور اس کا سبب کسی درجے میں قرآن کے ماننے والے ہوں گے۔لہذا قرآن کے ماننے والوں کے لئے لازم ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔واضح رہے کہ اس فریضہ میں صرف عبادات ہی نہیں داخل ہیں بلکہ خدا کی کائنات اور اس کی دوسری مخلوق کا تحفظ اور اس کی تعمیر بھی شامل ہے۔

حوالے:

(۱) waqi.info//:http

(۲) دہلوی، شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر، مترجم: الندوی سید سلمان الحسینی۔القاہرۃ: دار الصحوۃ۔1986 ص:30۔

(۳)J.L Chapman, M.J. Reiss. Ecology :principles and applications. Second edition. Cambridge :Cambridge University press, 2012.2, G.R. Chatwal and Harish Sharma. A text book of environmental studies. Mumbai :Himalya publishing hose, 2004

(۴) القرآن، بقرۃ:۹۲' (۵)القرآن، البقرۃ:۲۲' (۶)القرآن، النحل:۵'(۷)القرآن، النحل:۸'(۸)القرآن، النحل:۱۰'(۹)القرآن، النحل:۱۱'(۱۰)القرآن، النحل:۸۱'(۱۱)القرآن، البقرۃ:۰۳'

(۱۲)القرآن، الرحمان:۴'(۱۳)القرآن، الرحمان:۷'(۱۴)القرآن، الرحمان:۱۰'(۱۵)القرآن، بنی اسرائیل:۴۴' (۱۶)القرآن، البقرۃ:۵۰۲' (۱۷)القرآن، الروم:۱۴'(۱۸)القرآن، بنی اسرائیل:۷۲'

(۱۹)القرآن آل عمران:۱۱۴'(۲۰)القرآن، النحل:۹۷'(۲۱)القرآن، الاعراف:۱۳'(۲۲)القرآن، بقرۃ:۵۰۲'(۲۳) القرآن، مائدۃ۲۳'(۲۴)القرآن، مائدۃ:۳۳'(۲۵)القرآن، مائدۃ:۴۶

(۲۶)القرآن، انفال:۳۷'(۲۷)القرآن، ہود:۶۱۱'(۲۸)القرآن، القصص:۷۷'(۲۹)القرآن، القصص:۳۸'(۳۰)القرآن، الروم:۱۴'(۳۱)القرآن، المومن:۶۲'(۳۲)القرآن، الفجر:۲۱

(۳۳)Chatwal,G.R, Sharma Harish, AText Book of Environmental Studies,. Mumbai:Himalia Publishing House.2005

(۳۴)رحمانی، خالد سیف اللہ، آسان تفسیر، حیدرآباد، المعہد العالی الاسلامی۔۹۱۰۲۔

☆☆☆

محمد عامر مجیبی

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' گچی باؤلی' حیدرآباد۔32

www.urduacademyts.com

ستاروں سے آگے

کرتار سنگھ نے اونچی آواز میں ایک اور گیت گانا شروع کر دیا۔ وہ بہت دیر سے ماہیا الاپ رہا تھا جس کو سنتے سنتے حمیدہ کرتار سنگھ کی پنکج جیسی تانوں سے، اس کی خوبصورت داڑھی سے، ساری کائنات سے اب اس شدت کے ساتھ بیزار ہو چکی تھی کہ اسے خوف ہو چلا تھا کہ کہیں وہ سچ مچ اس خواہ مخواہ کی نفرت و بیزاری کا اعلان نہ کر بیٹھے۔ اور کامریڈ کرتار ایسا سویٹ ہے فوراً برا مان جائے گا۔ آج کے پیچ میں اگر وہ شامل نہ ہوتا تو باقی کے ساتھی تو اس قدر سنجیدگی کے موڈ میں تھے کہ حمیدہ کو زندگی سے اکتا کر خودکشی کرنا جاتی۔ کرتار سنگھ گڈو گراموفون تک ساتھ اٹھا لایا تھا۔ ملکہ پکھراج کا ایک ریکارڈ تو کیمپ ہی میں ٹوٹ چکا تھا، لیکن خیر۔

حمیدہ اپنی سرخ کنارے والی ساری کے آنچل کو شانوں کے گرد بہت احتیاط سے لپیٹ کر ذرا اور اوپر کو ہو کے بیٹھ گئی جیسے کامریڈ کرتار سنگھ کے ماہیا کو بے حد دلچسپی سے سن رہی ہے۔ لیکن نہ معلوم کیسی الٹی پلٹی الجھی الجھی بے تکی باتیں اس وقت اس کے دماغ میں گھسی آ رہی تھیں۔ وہ ''جاگ سوز عشق جاگ'' والا بیچارہ ریکارڈ شکنتلا نے توڑ دیا تھا۔

''افوہ بھئی۔'' بیل گاڑی کے ہچکولوں سے اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا اور ابھی کتنے بہت سے کام کرنے کو پڑے تھے۔ پورے گاؤں کو ہیضے کے ٹیکے لگانے کو پڑے تھے۔ ''توبہ!'' کامریڈ صبیح الدین کے گھونگریالے بالوں کے سر کے نیچے رکھے ہوئے دواؤں کے بکس میں سے نکل کے دواؤں کی تیز بو سیدھی اس کے دماغ میں پہنچ رہی تھی اور اسے مستقل طور پر یاد دلائے جا رہی تھی کہ زندگی واقعی بہت تلخ اور ناگوار ہے .... ایک گھسا ہوا، بیکار اور فالتو سا ریکارڈ جس میں سے سوئی کی ٹھیس لگتے ہی وہی مدھم اور لرزتی ہوئی تانیں بلند ہو جاتی تھیں جو نغمے کی لہروں میں قید رہتے رہتے تھک چکی تھیں۔ اگر اس ریکارڈ کو، جو مدتوں سے ریڈیوگرام کے نچلے خانے میں تازہ ترین البم کے نیچے دبا پڑا تھا، زور سے زمین پر پٹخ دیا جاتا تو حمیدہ خوشی سے ناچ اٹھی۔ کتنی بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو وہ چاہتی تھی کہ دنیا میں نہ ہوتیں تو کیسا مزہ رہتا۔۔۔ اور اس وقت تو ایسا لگا جیسے سچ مچ اس نے "I dream I dwell in marble halls" والے گھسے ہوئے ریکارڈ کو فرش پر پٹخ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور جھک کر اس کی کرچیں چنتے ہوئے اسے بہت ہی لطف آ رہا ہے۔ عنابی موزیک کے اس فرش پر، جس پر ایک دفعہ ایک ہلکے پھلکے فوکس ٹروٹ میں بہتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ بس زندگی سمٹ سمٹا کے اس چمکیلی سطح، ان زرد پردوں کی رومان آفریں سلوٹوں اور دیواروں میں سے جھانکتی ہوئی ان مدھم برقی روشنیوں کے خواب آور دھندلکے میں سما گئی ہے، یہ تپش انگیز جاز یونہی بجتا رہے گا، اندھیرے کونوں میں رکھے ہوئے سیاہی مائل سبز فرن کی ڈالیاں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں

افسانہ

www.urduacademyts.com

اس طرح ہچکولے کھاتی رہیں گی اور ریڈیو گرام ہمیشہ پولکا اور رمبا کے نئے نئے ریکارڈ لگتے جائیں گے۔ یہ تھوڑا ہی ممکن ہے کہ جو باتیں اسے قطعی پسند نہیں وہ بس ہوتی ہی چلی جائیں .... ریکارڈ گھستے جائیں اور ٹوٹتے جائیں۔

.... لیکن یہ ریکارڈوں کا فلسفہ ہے آخر؟ حمیدہ کو ہنسی آ گئی۔ اس نے جلدی سے کرتار سنگھ کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اس کے گانے پر ہنس رہی ہے۔

کامریڈ کرتار گائے جا رہا تھا۔ ''وس وس وے ڈھولنا.... '' اف! یہ پنجابی کے بعض الفاظ کس قدر بھونڈے ہوتے ہیں۔ حمیدہ ایک ہی طریقے سے بیٹھے بیٹھے تھک کے بانس کے سہارے آگے کی طرف جھک گئی۔ بہتی ہوئی ہوا میں اس کا سرخ آنچل پھٹپھٹائے جا رہا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ اسے چمپئی رنگ کی ساری بہت سوٹ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ کے سب لڑکے کہا کرتے تھے اگر اس کی آنکھیں ذرا اور سیاہ اور ہونٹ ذرا اور پتلے ہوتے تو ایشیائی حسن کا بہترین نمونہ بن جاتی۔ یہ لڑکے عورتوں کے حسن کے کتنے قدردان ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ہر سال کس قدر چھان بین اور تفصیلات کے مکمل جائزے کے بعد لڑکیوں کو خطاب دیے جاتے تھے اور جب نوٹس بورڈ پر سال نو کے اعزازات کی فہرست لگتی تھی تو لڑکیاں کیسی بے نیازی اور خفگی کا اظہار کرتی ہوئی اس کی طرف نظر کئے بغیر کوریڈور میں سے گزر جاتی تھیں۔ کمبخت سوچ سوچ کے کیسے مناسب نام ایجاد کرتے تھے۔ ''عمر خیام کی رباعی''، ''دہرہ ایکسپریس''، ''بال آف فائر''، "Its Love Im after"، ''نقوش چغتائی''، ''بلڈ بنک''۔

گاڑی دھچکے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ ''کیا بجا ہوگا کامریڈ؟''

گاڑی کے پچھلے حصے میں سے منظور نے جمائی لے کر جتندر سے پوچھا۔

''ساڑھے چار۔ ابھی ہمیں چلتے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا۔'' جتندر اپنا چارخانہ کوٹ گاڑی بان کے پاس پرال پر بچھائے، کہنی پر سر رکھے چپ چاپ پڑا تھا۔ شکنتلا بھی شاید سونے لگی تھی حالانکہ وہ بہت دیر سے اس کوشش میں مصروف تھی کہ بس ستاروں کو دیکھتی رہے۔ وہ اپنے پیر ذرا اور نہ سکیڑتی لیکن پاس کی جگہ کامریڈ کرتار نے گھیر رکھی تھی۔ شکنتلا بار بار خود کو یاد دلا رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں اتنی سی بھی نیند نہیں گھسنی چاہیے۔ ذرا ویسی یعنی نامناسب سی بات ہے، لیکن دھان کے کھیتوں اور گھنے باغوں کے اوپر سے آتی ہوئی ہوا میں کافی خنکی آ چلی تھی اور ستارے مدھم پڑتے جا رہے تھے۔

''بس بس وے ڈھولنا'' اور اب کرتار سنگھ کا جی بے تحاشا چاہ رہا تھا کہ اپنا صافہ اتار کر ایک طرف ڈال دے اور ہوا میں ہاتھ پھیلا کے ایک ایسی زوردار انگڑائی لے کہ اس کی ساری تھکن، کوفت اور درماندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کہیں کھو جائے یا صرف چند لمحوں کے لئے دوبارہ وہی انسان بن جائے جو کبھی جہلم کے سنہرے پانیوں میں چاند کو ہلکورے کھاتا دیکھ کر امرجیت کے ساتھ پنکج کی سی تانیں اڑایا کرتا تھا۔ یہ لمحے،

www.urduacademyts.com

جب کہ تاروں کی بھیگی بھیگی چھاؤں میں بیل گاڑی کچی سڑک پر گھسٹتی ہوئی آگے بڑھتی جارہی تھی، اور جب کہ سارے ساتھیوں کے دلوں میں ایک بیمار سا احساس منڈلا رہا تھا کہ پارٹی میں کام کرنے کا آتشیں جوش وخروش کب کا بجھ چکا تھا۔

ہوا کا ایک بھاری سا جھونکا گاڑی کے اوپر سے گزر گیا اور صبیح الدین اور جتندر کے بال ہوا میں لہرانے لگے لیکن کرتار سنگھ لیڈیز کی موجودگی میں اپنا صافہ کیسے اتارتا؟ اس نے ایک لمبا سانس لے کر دواؤں کے بکس پر سر ٹیک دیا اور ستاروں کو تکنے لگا۔ ایک دفعہ شکنتلا نے اس سے کہا تھا کہ کامریڈ تم اپنی داڑھی کے باوجود کافی ڈیشنگ لگتے ہو اور یہ کہ اگر تم ائیر فورس میں چلے جاؤ تو اور بھی killing لگنے لگو۔

اف یہ لڑکیاں!

''کامریڈ سگریٹ لو۔'' صبیح الدین نے اپنا سگریٹوں کا ڈبہ منظور کی طرف پھینک دیا۔ جتندر اور منظور نے ماچس کے اوپر جھک کے سگریٹ سلگائے اور پھر اپنے اپنے خیالوں میں کھو گئے۔ صبیح الدین ہمیشہ عبداللہ اور کریون اے پیا کرتا تھا۔ عبداللہ اب تو ملتا بھی نہیں۔ صبیح الدین ویسے بھی بہت ہی رئیسانہ خیالات کا مالک تھا۔ اس کا باپ تو ایک بہت بڑا تعلقہ دار تھا۔ اس کا نام کتنا اسمارٹ اور خوبصورت تھا۔ صبیح الدین احمد.... مخدوم زادہ راجہ صبیح الدین احمد خاں! افوہ! اس کے پاس دو بڑی چمکدار موٹریں تھیں۔ ایک موریس اور ایک ڈی۔ کے۔ ڈبلیو۔ لیکن کنگ جارجز سے نکلتے ہی آئی ایم ایس میں جانے کی بجائے وہ پارٹی کا ایک سرگرم ورکر بن گیا۔ حمیدہ ایسے آدمیوں کو بہت پسند کرتی تھی۔ آئیڈیل قسم کے۔ لیکن اگر صبیح الدین اپنی موریس کے اسٹیئرنگ پر ایک بازو رکھ کے اور جھک کے اس سے کہتا کہ حمیدہ مجھے تمہاری سیاہ آنکھیں بہت اچھی لگتی ہیں، بہت ہی زیادہ .... تو یقیناً اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کرتی۔ ''ہونہہ.... دیز ایڈیٹس!''۔

صابن کے رنگین بلبلے!

کرتار سنگھ خاموش تھا۔ سگریٹ کی گرمی نے منظور کی تھکن اور افسردگی ذرا دور کردی تھی۔ ہوا میں زیادہ ٹھنڈک آچکی تھی۔۔

جتندر نے اپنا چارخانہ کوٹ کندھوں پر ڈال لیا اور پرانی پرال میں ٹانگیں گھسا دیں۔ منظور کو کھانسی اٹھنے لگی۔

''کامریڈ تم کو اپنے زیادہ سگریٹ نہیں پینے چاہئیں۔'' شکنتلا نے ہمدردی کے ساتھ کہا۔ منظور نے اپنے مخصوص انداز سے زبان پر سے تمباکو کی پتی ہٹائی اور سگریٹ کی راکھ نیچے جھٹک کر دور باجرے کی لہراتی ہوئی بالیوں کے پرے افق کی سیاہ لکیر کو دیکھنے لگا۔ .... یہ لڑکیاں! طلعت کیسی فکرمندی کے ساتھ کہا کرتا تھا۔ ''منظور! تمہیں سردیوں بھر ٹانک استعمال کرنے چاہئیں۔ اسکاٹس ایملشن یا ریڈیو مالٹ یا آسٹو مالٹ .... طلعت، ایرانی بلی! پہلی مرتبہ جب بوٹ کلب Regatta میں ملی تھی تو اس نے ''اوہ گوش! تو آپ جرنلسٹ ہیں.... اور اوپر سے کمیونسٹ بھی۔ افوہ!'' اب انداز سے کہا تھا کہ ہیڈی لیماری بھی رشک کرتی۔ پھر، مرمریں ستون کے پاس، پام کے پتوں کے نیچے بیٹھا دیکھ لیا تھا اور اس کی طرف

www.urduacademyts.com

آئی تھی.... کتنی ہمدرد.... یقیناً۔اس نے پوچھا تھا:''

''ہیلو چائلڈ۔ہاؤازلائف؟''

Ask me another منظور نے کہا تھا۔

''اللہ! لیکن یہ تم سب کو آخر کیا ہوگا''۔فکر جہاں کھائے جارہی ہے۔مرے جارہے ہیں۔سچ مچ تمہارے چہروں پر تو نحوست ٹپکنے لگی ہے۔کہاں کا پروگرام ہے؟ مسوری چلتے ہو؟ پرلطف سیزن رہے گا اب کی دفعہ۔ بنگال؟ ارے ہاں، بنگال۔تو ٹھیک ہے۔ ہاں میری بہترین خواہشیں اور دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ پکچر چلو گے۔''جین آئر'' اس قدر غضب کی ہے گوش!'' پھر وہ چلی گئی۔ پیچھے کافی کی مشین کا ہلکا ہلکا شور اسی طرح جاری رہا اور دیواروں کی سبز روغنی سطح پر آنے جانے والوں کی پرچھائیں رقص کرتی رہیں اور پھر کلکتے آنے سے ایک روز قبل منظور نے سنا کہ وہ اصغر سے کہہ رہی تھی۔''ہونہہ.... منظور؟''

صبیح الدین ہلکے ہلکے گنگنا تا رہا تھا۔کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں۔ یقیناً! بس کہنے کی دیر ہے۔حمیدہ کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ بکھر کے رہ گئی۔ دور دریا کے پل پر گھڑگھڑاتی ہوئی ٹرین گزر رہی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ روشنیوں کا عکس پانی میں ناچتا رہا، جیسے ایک بلوری میز پر رکھے ہوئے چاندی کے شمع دان جگمگا اٹھیں۔ چاندی کے شمع دان اور انگوروں کی بیل سے چھپی ہوئی بالکونی، آئس کریم کے پیالے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور برقی پنکھے تیزی سے چل رہے تھے۔ پیانوں پر بیٹھی ہوئی وہ اپنے آپ کو کس طرح طربیہ کی ہیروئن سمجھنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

"Little Sir Echo how do you do, Hell hello won't you come over nad dance with me".

پھر رافے اسٹیئرنگ پر ایک بازو رکھ کر رابرٹ ٹائیلر کے انداز سے کہتا تھا۔''حمیدہ تمہاری یہ سیاہ آنکھیں مجھے بہت پسند ہیں.... بہت ہی زیادہ'' یہ بہت ہی زیادہ'' حمیدہ کے لئے کیا نہ تھا؟ اور جب وہ سیدھی سڑک پر پینتالیس کی رفتار سے کار چھوڑ کر وہی "I dreamed well in marble halls." گانا شروع کردیتا تو حمیدہ یہ سوچ کر کتنی خوش ہوتی اور کچھ فخر محسوس ہوتا کہ رافے کی ماں موزا ارٹ کی ہم وطن ہے.... آسٹرین۔اس کی نیلی چھلکتی ہوئی آنکھیں، اس کے نارنجی بال.... اف اللہ! اور کسی گھنے ناشپاتی کے درخت کے سائے میں کار ٹھہر جاتی اور حمیدہ جام کا ڈبہ کھولتے ہوئے سوچتی کہ بس میں بسکٹوں میں جام لگاتی رہوں گی۔رانی انہیں کترتا رہے گا۔اس کی بیوک پینتالیس کی رفتار پر چلتی جائے گی اور یہ چناروں سے گھری ہوئی سڑک کبھی ختم نہ ہوگی۔

لیکن ستاروں کی شمعیں آپ سے آپ بجھ گئیں۔ اندھیرا چھا گیا اور اندھیرے میں بیل گاڑی کی لالٹین کی بیمار روشنی ٹمٹمارہی تھی۔

ہولالالا.... دور کسی کھیت کے کنارے ایک کمزور سے کسان نے اپنی پوری طاقت سے چڑیوں کو ڈرانے کے

انشائیہ

www.urduacademyts.com

لئے ہانک لگائی۔ گاڑی بان اپنے مریل بیلوں کی دمیں مروڑ مروڑ کرانہیں گالیاں دے رہا تھا اور منظور کی کھانسی اب تک نہ رکی تھی۔۔

حمیدہ نے اوپر دیکھا۔ شبنم آلود دھندلکے میں چھپے ہوئے افق پر ہلکی ہلکی سفیدی پھیلنی شروع ہوگئی تھی کہیں دور کی مسجد میں سے اذان کی تھرائی ہوئی صدا بلند ہورہی تھی۔ حمیدہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور غیر ارادی طور پر آنچل سے سر ڈھک لیا۔ جتندرا اپنے چار خانہ کوٹ کا تکیہ بنائے شاید لیٹن کوارٹر اور سوسو کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مائیرا، ڈونا مائیرا۔ حمیدہ کی ساری کے آنچل کی سرخ دھاریاں اس کی نیم وا آنکھوں کے سامنے لہرا رہی تھیں۔ یہ سرخیاں، یہ تپتے ہوئے مہیب شعلے، جن کی جلتی ہوئی تیز روشنی آنکھوں میں گھس جاتی تھی اور جن کے لرزتے کپکپاتے سایوں کے پس منظر میں گرم گرم راکھ کے ڈھیر رات کے اڑتے ہوئے سناٹے میں اس کے دل کو اپنے بوجھ سے دبائے ڈال رہے تھے۔ مائیرا، اس کے نقرئی قہقہے، اس کا گٹار، اکھڑی ہوئی ریل کی پٹڑیاں اور ٹوٹے ہوئے کھمبے۔ سانتا کلاوڈ کا وہ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن جس کے خوبصورت پلیٹ فارم پر ایک اتوار کو اس نے سرخ اور زرد گلاب کے پھول خریدے تھے۔ وہ لطیف سا، رنگین سا سکون جو اسے مائیرا کے تاریخی بالوں کے ڈھیر میں ان سرخ شگوفوں کو دیکھ کے حاصل ہوتا تھا۔

وہ تھک کے گٹار سبزے پر ایک طرف پھینک دیتی تھی اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ ساری کائنات سرخ گلاب اور ستارہ ہائے سحری کی کلیوں کا ایک بڑا سا ڈھیر ہے۔

لیکن تاکستانوں میں گھرے ہوئے اس ریلوے اسٹیشن کے پرخچے اڑ گئے اور طیاروں کی گڑگڑاہٹ اور طیارہ شکن توپوں کی گرج میں شوبرٹ ''Rose .... monde'' کی لہریں اور گٹار کی رسیلی گونج کہیں بہت دور فیڈ آوٹ ہوگئی اور حمیدہ کا آنچل صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھٹپھٹا تا رہا، اس سرخ پرچم کی طرح جسے بلند رکھنے کے لئے جدوجہد اور کشمکش کرتے کرتے وہ تھک چکا تھا، اکتا چکا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

''سگریٹ لو بھئی۔''، صبیح الدین نے منظور کو آواز دی۔

''اب کیا بج گیا ہوگا؟'' شکنتلا بہت دیر سے زیرلب بھیرو کا ''جاگون موہن پیارے'' گنگنا رہی تھی۔

حمیدہ سڑک کی ریکھائیں گن رہی تھی اور کرتار سنگھ سوچ رہا تھا کہ ''وس وس وے ڈھولنا'' پھر سے شروع کردے۔

گاؤں ابھی بہت دور تھا۔۔۔۔

☆☆☆

لمحۂ فکر

رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا تھا:

''انسان مذہب کے لئے اپنا مال لٹادے گا' اپنی جان دے دے گا اور جنگیں لڑے گا لیکن مذہب کے مطابق زندگی نہیں بسر کرے گا!''۔

اس قول کے مطابق ہم دیکھیں کہ کہیں ہم ایسا ہی تو نہیں کررہے۔

www.urduacademyts.com

بے گور

کلکتہ کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک کمرے کی گھنٹی کی آواز سن کر امریکی ڈاکٹر دروازہ کھولنے لگا۔

''کون؟''

''میں رام دین ہوں صاحب!

''تم آ گئے؟ آؤ میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا؟

''اگر آپ تیرا ہیں تو چلیئے۔

''ہاں چلو، کیا پورے پچاس کا انتظام ہو گیا؟''

''ہاں، صاحب۔ سَو یا ہزار بھی ہوتے تو یہاں کیا کمی ہے؟''

''تو چلو۔''

وہ دونوں کمرے سے نکل کر باہر ہوٹل کے پورچ میں پہنچے تو امریکی ڈاکٹر کا ڈرائیور اُسے دیکھ کر کار وہیں لے آیا۔ امریکی ڈاکٹر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور رام دین آگے ڈرائیور کے ساتھ۔

''کہاں چلنا ہے؟''

چاؤرنگی۔

''کیا یہ نام کسی بہت بڑے مردہ خانے کا ہے؟۔

''نہیں۔ ہاں، یہی سمجھ لیجیے صاحب۔''

''چلو ڈرائیور۔''

ڈرائیور نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا تو وہ پہلے تو کسی ذی رُوح کے مانند کھی کھی ہنس پڑی اور پھر گویا کھڑے کھڑے ہوٹل کے باہر آگے سڑک پر اُڑنے لگی۔

''تم نے واقعی کمال کر دیا رام دین۔ ایک دم پورے پچاس کا انتظام کر دیا۔''

''ہمارے دیس میں بڑی سے بڑی ضرورت کا بھی ایک دم انتظام ہو جاتا ہے۔ بس آپ کی جیب میں پیسے ہوں۔''

''فکر مت کرو، مال ملتے ہی دام چکا دیئے جائیں گے۔''

نہیں صاحب، پیسوں کی مجھے فکر نہیں۔ آپ کے ملک سے میرا پرانا لین دین ہے۔ مجھے معلوم ہے امریکی بڑے کھرے اور زندہ لوگ ہوتے ہیں۔''

''یہی تو ہم ڈاکٹروں کی مصیبت ہے۔ ہمارے دیس میں کسی کے مرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔''

''لیکن مرنے والے تو مرتے ہی ہوں گے؟''

''نہیں مرنے کا ارادہ کر کے بھول جاتے ہیں۔''

''ہہ۔ ہہ ہا۔ ہہ۔ ہمارے ڈاکٹر تو ہر وزٹ کی فیس ساتھ ساتھ چارج کر لیتے ہیں کہ آگے وزٹ سے پہلے ہی مریض چلتا نہ بنے۔''

''ہاں جہاں موتیں اتنی عام وہاں ڈاکٹر کیا کریں! چھوٹے چھوٹے بل وصول کرنے کے لیے کیا وہ مردوں کے پیچھے ہولیا کریں!۔

امریکی ڈاکٹر کی نگاہ اچانک باہر کے لوگوں کے سیلاب پر اُٹھ گئی اور وہ جُھر جُھری سی لے کر رہ گیا۔ کسی کے چہرے پر شخصی زندگی کے آثار نہ تھے۔ سب ہی اپنے آپ

افسانے

www.urduacademyts.com

اِدھراُدھرآجارہے تھے۔ایک دوسرے سے بے خبر ہیں، لیکن نہ جانے کہاں ۔اُن کی آنکھیں انھیں کچھ بتائے بغیر دیکھ رہی تھیں۔ پاؤں از خود اُٹھ رہے تھے۔اتنا شور وشغب تھا مگر انہیں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

ڈاکٹر نوٹ بک اور قلم نکال کر لکھنے لگا۔

۱۵/جون ۔۱۹۵۷ء۔ کلکتہ کی ایک سڑک۔سڑک پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ہیں، مگر تعجب ہے کہ کسی میں بھی زندگی کے کوئی آثار نہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ قبروں میں ان کا دم گھٹنے لگا اور سب کے سب باہر نکل آئے یا باہر آ کے تھک ہار گئے اور اب قبروں کی طرف لوٹ رہے ہیں......وہ لکھتے ہوئے رُک گیا اور کار کے باہر گھورنے لگا۔کیا یہ لوگ واقعی زندہ ہیں؟ اس سانحہ کی طبی نوعیت تک پہنچنے کے لیے وہ بڑی جوش آفریں متانت سے سوچ رہا تھا۔ہاں، کیوں نہیں؟ اگلے مہینے میں اپنے یہاں ڈاکٹروں کی کانفرنس میں بڑی سنجیدگی سے یہ سوال اٹھاؤں گا۔عین ممکن ہے کہ .....نہیں! نہیں کیوں؟ ہوسکتا ہے کہ انسانی مشین بدستور چلتی رہے مگر انسان مر چکا ہو۔

ہاں اسے ثابت کیا جا سکے تو۔۔۔نہیں! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ پھر باہر دیکھنے لگا۔نہیں، جب ہو ہی گیا ہے تو کیسے نہیں ہوسکتا؟ وہ مسکرانے لگا۔

سامنے چوک پر میکانیکی سرخ بتی آجانے پر ڈرائیور نے پٹری کی جانب اپنی قطار میں گاڑی روک لی اور ڈاکٹر چہروں کی بھیڑ میں کسی ایک پر نظر جمانے کی کوشش کرنے لگا۔مگر طغیانی میں آنکھیں کہاں ٹک پاتی ہیں؟ اسی اثناء میں اس کی گاڑی کے قریب سے چند لوگ گزرنے لگے اس نے اپنا سر کھڑکی کی طرف بڑھا کر ان کی طرف مسکرا کر دیکھا مگر وہ اس سے، ایک دوسرے سے، اپنے آپ سے بھی قطعی بے خبر چلتے گئے۔گرین لائٹ آتے ہی کار حرکت میں آگئی۔ان لوگوں میں سے کوئی شخص مجھ سے اپنی موت کا سرٹیفکیٹ طلب کرے تو؟ ہاں، کیوں نہیں اگر وہ زندہ نہیں تو اُسے اپنی موت کا سرٹیفکیٹ طلب کرنے کا حق حاصل ہے یا پھر کسی موت کا قانونی سرٹیفکیٹ دینے سے پہلے کسی طرح کا طبی معائنہ صحیح ہوگا؟

ڈاکٹر نے اپنے خطیبانہ سوال سے بے چین ہوکر سگریٹ سلگا لیا، لیکن شاید سگریٹ نوشی کے خطرناک نتائج پر کسی مقالے کا اچانک خیال آجانے پر اُسے فوراً بجھا دیا اور سیٹ پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

''ہاں۔ہاں! ڈاکٹر نے اپنے خیالات سے چونک کر جواب دیا۔

''وہ۔اُدھر۔وہ پڑی ہے نا۔کوئی پون گھنٹہ پہلے کی بات ہے کہ میں یہاں سے گزر رہا تھا۔وہ وہاں اُس ستون کے پاس پڑی ہوئی ایک لاش یک بارگی اُٹھ کھڑی ہوئی اور چلّانے لگی۔سنو! ارے بھئی !۔مگر کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔وہ اور زور سے چلانے لگی! ایک لاش تم سے مخاطب ہے لوگو! سنو۔لوگ اس کی طرف دیکھے بغیر اپنی اپنی راہ چلتے رہے۔

www.urduacademyts.com

''کیا یہ نہیں ہوسکتا رام دین جسے تم لاش کہہ رہے ہو ساری بھیڑ بھاڑ میں صرف وہی زندہ ہو اور باقی سارے کے سارے مردہ؟''

''مگر صاحب' ان باقی سب میں تو میں بھی تھا۔ اگر آپ میرا فری میڈیکل ٹیسٹ کرنے پر رضامند ہیں تو بے شک اطمینان کر لیجیے۔ میں تو زندہ ہوں!

''تو پھر تم ہی اس لاش کی مدد کرنے کے لیے رک گئے ہوتے''

''کیسے رُک جاتا؟ مجھے عین وقت پر آپ سے ہوٹل میں ملنا جو تھا۔''

''پورے پچاس کا انتظام کر کے آئے ہو نا؟''

''ہاں صاحب' کہہ دیا نا پورے پچاس کا۔ آپ چاہیں تو پورے سو بھی خرید سکتے ہیں۔''

''ویری گڈ!۔ اچھا بتاؤ' بھلا وہ لاش کہنا کیا چاہ رہی تھی''

''صرف یہ کہ مجھے دم توڑے چھ گھنٹے سے بھی اوپر ہو لیے ہیں' کوئی خدا کا بندہ مجھ پر رحم کھائے اور کسی قبرستان کی راہ پر ڈال آئے۔''

''پھر؟''

''پھر کیا؟ کسی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ بے چاری مایوس ہو کر آپ ہی اپنے لیے کوئی قبرستان ڈھونڈنے کہیں نکل گئی ہوگی؟

''مگر کیا وہ لاش سچ مچ کی لاش تھی؟''

رام دین ہنسنے لگا'' آپ اتنے پہنچے ہوئے ڈاکٹر ہیں صاحب۔ آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ لاش ہو گی تو سچ مچ کی ہی ہوگی۔''

''ہاں۔ ہاں' اس میں کیا شک ہے؟''

امریکی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا سوچے۔ اس لیے سوچے بغیر وہ رام دین سے پوچھنے لگا۔ کیا تمہارے یہاں موت کا سرٹیفکیٹ لینا ضروری نہیں''

رام دین پھر ہنس پڑا۔ آپ امریکی لوگ اتنے سمجھ دار ہوتے ہیں صاحب' پھر بھی بھولے کے بھولے۔ اس لاش کو کوئی قبرستان کے راستے پر بھی نہیں ڈال رہا تھا۔ غریب موت کے سرٹیفکیٹ کے لیے دفتروں کے چکر کہاں کاٹتی پھرتی یا پھر رشوت دے کر زندگی میں ہی سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتی۔ مگر رشوت کے پیسے ہوتے تو ان سے دوا دارو کر لیتی۔ اس کا مرنا ہی کیوں ہوتا؟''

رام دین کے مذاق کا لہجہ ڈاکٹر کو بھونڈا بھی لگ رہا تھا اور دلچسپ بھی۔

''آپ شاید یہ سوچ رہے ہیں صاحب کہ سرٹیفکیٹ کے بغیر اُس بھلے آدمی کو پتہ کیسے چل گیا کہ اُس کی موت واقع ہو چکی ہے۔

''ہاں ہمیں تو کسی کے مرنے کا یقین اُسی وقت آتا ہے جب اُس کی موت کی ڈاکٹر تصدیق ہو جائے۔''

''آپ کی بات اور ہے صاحب۔ ہمارے سارے سرٹیفکیٹ جعلی ہوتے ہیں' اس لیے ہمیں اپنی موت پر

www.urduacademyts.com

اُسی وقت یقین آتا ہے جب ہم آپ ہی محسوس کرنے لگیں کہ ہم مر چکے ہیں۔ ڈرائیور' اب یہاں سے بائیں طرف مڑ جاؤ۔ ہمیں اسی گلی میں آنا تھا۔''

''تم لوگ اپنے ہسپتال اتنی تنگ اور گندی گلیوں میں کیوں بنواتے ہو؟''

''یہاں ہسپتال نہیں ہے۔''

''مگر مردہ خانہ تو اسپتال کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔''

''آپ آیئے تو صاحب' ہمارے غریبوں کو دواخانے اور مردہ خانے کہاں نصیب ہوتے ہیں؟۔ ٹھیر جاؤ' ڈرائیور! بس یہیں!''

گاڑی رُک گئی۔

امریکی ڈاکٹر نے دیکھا کہ کئی پھٹے حال بوڑھے۔ جوان اور بچے گلی میں ایک طرف قطار میں کھڑے ہیں۔

''یہاں کہاں لے آئے ہو؟''

''جہاں ہمیں آنا تھا'' رام دین گاڑی سے نکلتے نکلتے بات پوری کرنے کے لیے رک گیا۔

''آپ کے پاس آنے سے پہلے میں ہی انھیں یہاں کھڑا کر گیا تھا''

''مگر میں نے تو مردوں کا آرڈر دیا تھا''

''غور سے دیکھئے صاحب' کیا یہ لوگ آپ کو زندہ معلوم ہوتے ہیں؟''

''مجھے یہ مذاق پسند نہیں' رام دین۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں' صاحب' مردوں کو تو اپنے مر چکنے کا احساس بھی نہیں ہوتا' مگر انھیں غور سے دیکھئے' ہر ایک کو پورا احساس ہے کہ وہ مر چکا ہے۔''

امریکی ڈاکٹر گھبرا کر ان مفلوک الحال لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''عجیب آدمی ہو! میں نے تو کہا تھا ہمیں اپنے ملک میں طبی تجربوں کے لیے پچاس مردوں کی ضرورت ہے۔''

رام دین ہنسنے لگا'' نہیں صاحب' مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اتنی دور سے قبریں کھدوانے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا ساری دنیا کے ملک ہمارے دیس سے آدمی لے جاتے ہیں' آپ کو بھی ان سے کوئی ایسا کام لینا ہوگا جو صرف مرے کھپے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ رام دین اپنی ململ کی ٹوپی اُتار کر سر کھجانے لگا۔ ایک بات کہوں صاحب؟ ان سب کو آج کل میں مر ہی جانا ہے۔ بہت سے تو راستے میں جہاز پر ہی دم توڑ دیں گے۔ ان کی شکلیں دیکھیے اور بتایئے' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ چپکے سے ان ہی کو لے جایئے۔''

''بکواس بند کرو اور صاف صاف بتاؤ کیا تم پچاس مردے۔ سچ مچ کے مردے مہیا کر سکتے ہو؟'' رام دین نے سر کھجا کر اپنی ٹوپی پھر اُسی جگہ پر سجالی۔

''آپ کی میڈیکل سائنس تو ہماری سائنس سے

www.urduacademyts.com

بہت آگے نکل چکی ہے صاحب' آپ خود ہی ان سب کا ٹھونک بجا کر معائنہ کر لیجئے آپ کو یقین آجائے گا کہ یہی سچ مچ کے مردے ہیں۔ ٹھیریئے میں آپ کو موٹے طریقے سے سمجھا تا ہوں''

رام دین گاڑی سے نکل کر اُس قطار کی طرف آگیا اور کچھ بولے بغیر اس نے ایک آدمی کے منہ پر زور سے تھپڑ دے مارا۔

اُس آدمی نے مدافعت کی نہ گالی بکی' بس چپ چاپ جوں کا توں کھڑا رہا' گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

رام دین فاتحانہ چال سے واپس امریکی ڈاکٹر کے پاس آکھڑا ہوا۔

''کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں آیا کہ یہ سب کے سب سو فی صد مردے ہیں۔''

امریکی ڈاکٹر نے سراسیمہ خفگی کے ساتھ اپنے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔''واپس چلو ڈرائیور!''

''ٹھیریئے صاحب' میری مانیے اور انہیں لے جائیے۔ آپ جیسا تجربہ کرنا چاہتے ہیں اطمینان سے ان ہی پر کر لیجئے۔ ٹھیرو ڈرائیور! پیسے چاہیں تو اپنی تسلی کے بعد ادا کیجئے صاحب۔''

''چلو ڈرائیور!''

''اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے صاحب' ویسے مردے ہوتے تو آپ کا کارٹیج کا خرچ الگ ہوتا۔ یہ بے چارے تو آپ ہی اپنا سارا بوجھ اٹھا کر جہاز پر سوار ہو جائیں گے۔''

''چلو ڈرائیور!''

امریکی ڈاکٹر کی گاڑی آگے بڑھ گئی تو رام دین ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''بڑے بدقسمت ہو۔ اگر تم واقعی مر چکے ہوتے تو ٹھاٹ سے امریکہ جا پہنچتے۔''

☆☆☆

افسانے

حکایت

ایک بارہ سنگھے نے پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اپنے سینگوں کی شان اور خوبصورتی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن جب اس کی نظر اپنی پتلی پتلی ٹانگوں پر پڑی تو کہنے لگا کہ'' صانع قدرت نے یہ کیسی بے جوڑ ٹانگیں مجھ کو بخشی ہیں جو میرے سینگوں کی خوبصورتی کو بھی عیب لگاتی ہیں''۔ یہ دل میں سوچ رہا تھا کہ اتنے میں کوئی شکاری آپہنچا۔ بارہ سنگھا ایسا تیز بھاگا کہ شکاری کو اس کے ہاتھ آنے کی امید نہ رہی۔ لیکن تھوڑی دور جا کر جنگل کی جھاڑی میں اس کے سینگ اٹک گئے اور وہ پکڑا گیا۔ تب کہنے لگا'' ہائے میری بدعقلی! سینگوں سے میں خوش تھا وہی میری ہلاکت کا سبب ہوئے اور ٹانگوں کو میں برا جانتا تھا انہوں نے مجھے موت سے بچانے میں کچھ کمی نہ کی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو چیز وقت پر کام آنے والی ہو' اسی کو عزیز رکھنا رکھنا چاہیے گو وہ خوشنما نہ ہو۔

ماخوذ از ''منتخب الحکایات''

مصنفہ خان بہادر شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ ڈپٹی محمد نذیر احمد

www.urduacademyts.com

ہیلپ لائن

''یہ آٹو ہے ،آٹو۔ڈرائیور تو لگائے گا ہی بریک،مگر تار کا کیا بھروسا کہ کب چُٹ ہو جائے اور ٹپک پڑو آم کی طرح ،تار دیکھتا ہی کب ہے یہ کہ تم لکھ پتی ہو یا اَرب پتی....؟ پھر چاہے مار ہی کیوں نہ ڈالو ڈرائیور کو،آم نہیں لگنے کا پھر واپس ڈال پر۔'' کنہیّا لال نے کئی بار تو سمجھایا تھا اپنے پوتے دیپک کو ۔مگر وہ ماننے ہی والا کب تھا..؟اس پر تو یہاں کی شہنشاہیت کی مہر لگی تھی ، پوری طرح۔وہ جب بھی کالج سے چھوٹ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ سڑک پار کرتا ،تو مست ہاتھی کی طرح۔۔۔کوئی لاکھ چلّائے ،لاکھ سمجھائے ،ہارن بجائے۔مگر اس کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ایک بار تو بائک والے نے کہا بھی تھا :''میاں بائک کے تار کا بھروسا ہی کیا....؟''جس پر اُس نے جواب دیا:'' پھر میرے ہاتھ کا بھی کیا بھروسا...؟'' جس پر بائک والے نے کہا :''ہاتھ اُٹھانے کے لائق رہو گے تب نا....!''جس پر اُس نے لپک کر بائک والے کے یہ کہتے ہوئے کئی ہاتھ جڑ دِیے:''یہ ایڈوانس میں لیے جا۔''اس کے علاوہ بھی یہاں کے سبھی تو شہنشاہ ہیں، آٹو والے ہوں، یا پیدلیا،چلیں گے بیچ میں ہی۔سونے پہ سُہا گا یہ کہ لوگ لاکھ ہارن بجائیں،اِنڈیکیٹر جلائیں، ٹریفک والے، ہاتھ دیں' سیٹیاں بجائیں ،لیکن کوئی نہ تو سننے کو تیار اور نہ کوئی ہٹنے کو، بیچ سے۔

اُس دن بھی ، اِس بِنا سونڈ کے ہاتھی نے سب کچھ نظر انداز کر کے اپنا ہاتھ اٹھا کر چوراہا پار کرنے کے لیے قدم بڑھا ہی دیا ، بائک والے نے کس کے بریک مارا بھی ،لیکن بادشاہ سلامت ،سلامت نہ رہے۔کسی نے چوراہے پر لکھے ہِلپ لائن نمبر پر نظر پڑتے ہی فون مار دیا اور ہِلپ لائن والے فوراً آ گئے۔

کنہیّا لال ؛اچھی طرح جانتے تھے:''یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی ہے۔''وہ دیکھتے تھے کہ سڑکوں پر آئے دن ایکسیڈینٹ ہو جاتے ہیں۔مریض پڑے پڑے تڑپتے رہتے ہیں۔لوگ دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔بہت دیر تک تو یہی پتا نہیں چل پاتا کہ کون ہے....؟ کس کا ہے...؟ اور کہاں کا ہے....؟ جب تک پتا چلتا ہے، تب تک مریض چلا جاتا ہے۔اور اُس کے پریوار والوں کو کئی دن تلاشنے کے بعد بھی پتا نہ چلتا ہے۔تب تک کوئی سا ماجک سنستھا؛ اُس کا کریا کرم کر دیتی ہے، جیسے تیسے۔بہتیروں کا تو کبھی پتا ہی نہیں چل پاتا۔کچھ کا چل بھی جاتا ہے،تو پھر کیا ہوتا ہے۔چڑیاں تو کھیت چُگ چکی ہوتیں، پوری طرح۔پھر تو لوگ برابر سے رقم تولنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔یہی سب سوچ کر تو کنہیّا لال نے دیپک کو لاکھ سمجھایا تھا، پھر بھی نہ مانا وہ، تو

www.urduacademyts.com

یہی نقشہ اُن کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، اور اُنھوں نے آناً فاناً ہلپ لائن کی تشکیل کر ڈالی۔ ڈاکٹرز سے فوراً سروس دینے کی بات منظور کرالی۔ کئی گاڑیاں خریدیں۔ جہاں تہاں بہت سے بورڈ بنوا کر ان پر موبائل نمبر لکھوائے، بہت سا اسٹاف دوڑ دھوپ کے لیے رکھا۔ حالاں کہ کنہیّا لال ایک پرانے رئیس تھے۔ کاشت، باغات، اینٹ کے بھٹّے، کریشر اور نہ جانے کیا کیا بزنس تھے، اُن کے۔

خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ جس دن سے اُنھوں نے ہلپ لائن کی بنیاد ڈالی۔ اُسی دن سے آناً فاناً ترقی اور ہوئی، اُن کے روزگاروں میں۔ دومنزلہ مکان سے پانچ منزلہ مارولائز حویلی میں تبدیل ہوگیا۔ کئی اینٹ کے بھٹّے اور بڑھ گئے، وغیرہ وغیرہ۔ سب سے زیادہ یہ ہوا جیسا کہ وہ چاہتے تھے کہ بھگوان نہ کرے کہ اُن کے اکلوتے ضدّی پوتے دیپک کو کبھی کچھ ہوجائے تو ان کا سب کچھ دھرا رہ جائے گا۔ اُن کی وہی سوچ آج کام آگئی۔ دیپک کو فوراً ہلپ لائن مل گئی۔ لیکن بھگوان کا کرنا کچھ ایسا تھا کہ جب دیپک کا ایکسیڈنٹ ہوا تو کنہیّا لال امریکا کے ایک بڑے ہسپتال میں ایڈمٹ تھے۔ اُن کو جیسے ہی فون پر اطلاع ملی، اُنھوں نے فوراً وہاں کے ڈاکٹرز سے اپنی چھٹّی کی بات کی، لیکن ڈاکٹرز نے اُن کی صحت کو دیکھتے ہوئے اِجازت نہ دی۔ جب اُن کے بہت ہاتھ پیر مارنے سے بھی کام نہ چلا، تو اُنھوں نے آگرہ کے ڈاکٹرز سے فوراً رابطہ کیا۔ دیپک کی حالت بہت نازک تھی۔ اس لیے ڈاکٹرز نے کوئی اطمینان بخش جواب نہ دیا۔ آخر کار اُنھوں نے دیپک کو آئی۔ سی۔ یو۔ میں رکھ کر پیسا پانی کی طرح بہانے کا حکم دیا۔ اُن کے بیٹے بہو نے پانچ روز تک پیسا پانی کی طرح بہایا، لیکن ڈاکٹرز اپنی لاکھ کوششوں کے بعد بھی دیپک کو بچا نہ سکے۔ امریکا کے ڈاکٹرز نے کنہیّا لال کی صحت کو دیکھتے ہوئے اُن کی دو روز بعد چھٹی کرنے کا مشورہ دیا۔ کنہیّا لال کے حکم سے آگرہ میں دیپک کی لاش کو برف میں لگا دیا گیا۔ دوروز بعد کنہیّا لال بلکتے ہوئے دیپک کے کمرے میں داخل ہوئے، تو اُن کے سامنے نرسنگ ہوم کے ڈاکٹر کا لفافہ رکھا تھا۔ اُنھوں نے دیپک کے چہرے کو دیکھنے سے پہلے لفافہ اُٹھایا اور بِنا کھولے اس کو بڑی بے رحمی سے چاک کر کے ہوا میں اُڑا دیا۔ پھر اُنھوں نے دیپک کے چہرے پر نظر ڈالی، اُن کو لگا کہ دیپک اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے پھٹے لفافے کے ٹکڑوں کے ساتھ پھٹے نوٹوں کے اُڑتے ٹکڑے گھُور رہا ہے۔

☆☆☆

حنیف سیّد
12/34۔ سوئی کٹرا
آگرہ 282003 (یو، پی)
موبائل : 09319529720

www.urduacademyts.com

غزلیں

اقبال شیدائی

چہرے پہ تھکن، روح کو آزار سا کیوں ہے
ہر شخص مصائب میں گرفتار سا کیوں ہے
وہ جس کے لئے میں نے بنائیں نئی راہیں
حائل وہ مری راہ میں دیوار سا کیوں ہے
یوسف تو نہیں میں کوئی، معمولی بشر ہوں
ہر شخص مگر میرا خریدار سا کیوں ہے
چاہی ہے بھلائی ہی سدا میں نے سبھی کی
لوگوں کا چلن مجھ سے ہی اغیار سا کیوں ہے
چبھتا ہے نگاہوں میں کسی خار کی صورت
سیرت میں گلاب آج کا اک خار سا کیوں ہے
وہ شخص حسیں ہے، نہ امیر اور نہ ذی شاں
اُس فرد سے ہی مجھ کو بہت پیار سا کیوں ہے
کھائی تھی قسم جس نے مٹانے کی ستم کو
وہ شخص ہی ظالم کا مددگار سا کیوں ہے
کہتا ہے نجومی کہ مجھے تو نہ ملے گا
دل تیری محبت کا طلبگار سا کیوں ہے
گل جھڑتے تھے ہونٹوں سے کبھی جس کے مشیدؔ
اب اُس کا ہی لہجہ کسی تلوار سا کیوں ہے
محنت کا صلہ کیوں نہیں ملتا ہے سبھی کو
شیدائیؔ ہنر مند بھی بیکار سا کیوں ہے

☆☆☆

مکان: 24-1-346/C، سرورنگر، درگاہ روڈ
قاضی پیٹ، پوسٹ این آئی ٹی، ورنگل 506004
تلنگانہ اسٹیٹ، انڈیا۔ Cell: 9700449281

ڈاکٹر قطب سرشارؔ

دھوپوں کی تپش ہے کہیں پت جھڑ کی صدا ہے
سہمے ہوئے موسم کا گلا سوکھ رہا ہے
تحریر حنا، رمز طلب، خامہ لمحات
احساس نے برسوں یہی افسانہ پڑھا ہے
تاریخ کا تہذیب سے ہے ایسا ہی رشتہ
جو نطق کا احساس کے تیور سے رہا ہے
اخلاص و مروت خس و خاشاک ہوں جیسے
ہر دل سے اڑا لے گئی یہ کیسی ہوا ہے
سورج پہ مسلط ہے اندھیروں کی خدائی
شیشوں کے مقدر کو چٹانوں نے لکھا ہے
اب کھیل ہوا ختم نقابوں سے نکل آ
اے مہرباں میں نے تجھے پہچان لیا ہے
ایک شاخ پہ زیتون کی سہما ہوا پنچھی
پتا ذرا کھڑکا جو کہیں چونک اٹھا ہے
زرخیز زمینوں نے نمو اپنی جو کھو دی
نفرت کی ہر اک کوکھ سے ہتھیار اُگا ہے
اب کون یہاں کس کو گلے بڑھ کے لگائے
ہر پاؤں میں الجھی ہوئی زنجیر انا ہے
آسیب کا جادو کا کسے خوف ہے سرشارؔ
انسان تو انسان ہی سے خوف زدہ ہے

☆☆☆

مکان نمبر: 5-198/B/11، بی کے ریڈی
کالونی، محبوب نگر ۔ 509001
فون نمبر: 9703771012

www.urduacademyts.com

غزلیں

ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل

(اسداللہ خاں غالبؔ، شادؔ عظیم آبادی اور ناوکؔ حمزہ کی نذر)

ہماری غزلوں کو سن کے تم بھی، غزل سناؤ تو ہم بھی جانیں
جو دل کے اندر مچل رہی ہے، وہ لب پہ لاؤ تو ہم بھی جانیں

غزل کی شیریں زباں کا جادو، جو تم جگاؤ تو ہم بھی جانیں
پھر اس میں حسنِ غزل کا پہلوئے خاص لاؤ تو ہم بھی جانیں

غزل کا ہر شعر اپنے اندر، چھپائے رکھتا ہے خاص گوہر
دبی زباں سے جو حال دل تم، سناؤ تو ہم بھی جانیں

جناب ناوکؔ کا قول پڑھ کر، سمجھ میں آیا غزل کا تیور
دو چار غزلیں بھی شادؔ جیسی، جو کہہ کے لاؤ تو ہم بھی جانیں

غزل سے رشتہ ہے جانے کب سے، غزل کو پڑھتے ہے ہم
غزل کو سن کے غزل سراپا، جو بن کے آؤ تو ہم بھی جانیں

گمان بھی ہے یقین بھی ہے، یہ صنف نازک حسین بھی ہے
غزل کا شعری مزاج لے کر، یہ نغمہ گاؤ تو ہم بھی جانیں

غزل کو کہتے ہو نیم وحشی، یہ بات وحشت بھری ہے کیسی
تم اپنے دعوے کے حق میں کوئی دلیل لاؤ تو ہم بھی جانیں

نہیں ہے آساں غزل سرائی، مگر یہ خوشدلؔ کو راس آئی
غزل میں غالبؔ کا رنگ لا کر ہمیں دکھاؤ تو ہم بھی جانیں

☆☆☆

محمد حمید عکسی

اپنے خدا سے یارو تم اپنا دل لگانا
پھر اپنی بندگی سے دل کا سکون پانا

روداد اس کی سن کر اتنا سمجھ میں آیا
تھوڑی سی ہے حقیقت تھوڑا سا ہے فسانہ

اس میں خوشی کے لمحے ہوتے ہیں چند روزہ
دیتا ہے غم ہمیشہ بے درد یہ زمانہ

ماں باپ نے نصیحت دی تھی جو زندگی میں
میرے لیے وہی ہے انمول اک خزانہ

اب رو رہا ہوں اپنی میں زندگی میں ہر دم
بھاری پڑا ہے مجھکو اک پل کا مسکرانا

عکسی ہماری دنیا ہے اک سرائے فانی
آئے ہیں آج ہم تو کل کو پڑے گا جانا

☆☆☆

مکان نمبر:14-6-39، منڈی بازار پوسٹ،
ڈسٹرک ورنگل۔506002، تلنگانہ۔

حصہ نظم

www.urduacademyts.com

غزلیں

والی محمد زاہد ہریانوی

نفس امارہ سب سے جدا مانگے ہے
جس میں کامل ہو شفا ایسی دوا مانگے ہے

یہ تو سچ ہے کہ کسی کی وہ عطا مانگے ہے
سر یہ بیٹی کا حیاء کی بھی ردا مانگے ہے

ڈھاتا رہتا ہے جو عورت پہ ستم رک رک کر
وہ درندہ تو شریعت کی سزا مانگے ہے

کیا ہوا اُس کے تبسم سے بھرے چہرے کو
غم دوراں سے وہ گھبرا کے قضا مانگے ہے

ہر طرف آگ ہے نفرت کی لگی گلشن میں
اب چمن میرا' اُخوت کی فضا مانگے ہے

دور جا اُس سے یہ کہہ دیتی ہے غربت میری
جب امیری بھی' مرے گھر کا پتا مانگے ہے

جھکنے دیتی ہی نہیں مجھ کو سوا اک در کے
حق پرستی کا یہ جذبہ ہے انا مانگے ہے

ٹوٹتا جاتا ہے مرشد سے جو رشتہ تیرا
روح زاہد کی بھی روحانی غذا مانگے ہے

☆☆☆

مدرسہ دارالعلوم دکن' نزد مسجد قباء' نارسنگی'
عثمان ساگر روڈ' حیدرآباد۔ 500 089
Cell: 09000945368

ذکیہ شیخ مینا

اے قلم کار مرے حرف صداقت لکھنا
ورنہ بیکار ہے مضمون بلاغت لکھنا

عدل بکتا ہے جہاں سکوں کی جھنکاروں میں
مستحب ان پہ نظر آتا ہے لعنت لکھنا

دور حاضر میں ہے عنقا بشر یت کا وجود
سن مورخ تو اسے دور جہالت لکھنا

ہم نے دیکھی ہے جن آنکھوں میں سلگتی نفرت
کتنا مشکل ہے ان آنکھوں میں محبت لکھنا

آتش عشق میں جلتے ہیں سکوں پاتے ہیں
دشت پیروں کو مرے شوق کو وحشت لکھنا

زندگی اپنی گزرتی ہے بصورت طوفاں
ہر قدم سر پہ نئی ایک قیامت لکھنا

نکہت گل کے تو عاشق ہیں سبھی مینا تم
بستر خار پہ ہنسنے کی اذیت لکھنا

☆☆☆

303' بیلونیسٹ' پلاٹ نمبر 74' سیکٹر۔9
نیو پنویل' نوی ممبئی۔ 410206
Cell: 07715964647

www.urduacademyts.com

جناب کوپولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات، اقلیتی بہبود، بہبودی معمرین ومعذورین حکومت تلنگانہ
15 اگست کو 76 ویں یوم آزادی ہند کے موقع پر جگتیال میں پرچم کشائی انجام دیتے ہوئے

76 ویں یوم آزادی ہند کے موقع پر صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی جناب خواجہ مجیب الدین حج ہاؤز حیدرآباد میں واقع صدر دفتر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی پر
پرچم کشائی انجام دیتے ہوئے۔ تصویر میں جناب شاہ نواز قاسم آئی پی ایس ڈائریکٹر اقلیتی بہبود و ڈائریکٹر سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی،
مسٹر وی۔ کرشنا سپرنٹنڈنٹ، عہدیداران واراکین عملہ تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی دیکھے جاسکتے ہیں

Urdu Monthly

Qaumi Zaban

AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY

Vol. 07 No. 09 September 2022

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022

Date of Publication : 15th of every month

Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

جناب کے۔ چندرا شیکھر راؤ عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ نے 15 اگست کو 76 ویں یوم آزادی ہند کے موقع پر قلعہ گولکنڈہ پر پرچم کشائی انجام دی۔
تصویر میں جناب سومیش کمار معزز چیف سکریٹری حکومت تلنگانہ دیکھے جاسکتے ہیں

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone: 040-23237810, 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com